ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ
اکتوبر ۲۰۱۵ء

ماہنامہ میثاق (لاہور)

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

استحکامِ پاکستان کی واحد بُنیاد
امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(گیارھواں ایڈیشن) ——— صفحات: 360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سورۃ آلِ عمران تا سورۃ المائدہ
(آٹھواں ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سورۃ یُونس تا سورۃ الکہف
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 485 روپے

حصہ پنجم سورۃ مریم تا سورۃ السجدۃ
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سورۃ الاحزاب تا سورۃ الحجرات
(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات 484، قیمت 590 روپے

حصہ ہفتم سورۃ قٓ تا سورۃ النّاس
(پہلا ایڈیشن) ——— صفحات 560، قیمت 650 روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
شائع کردہ: مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد : 64

شمارہ : 10

ذوالحجہ 1436ھ

اکتوبر 2015ء

فی شمارہ 30/-

مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک 300 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

فون: 36316638 - 36366638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

- **تذکرہ وتبصرہ** — 5
  استحکامِ پاکستان کی واحد بنیاد — حافظ عاکف سعید
- **بیانُ القُرآن** — 23
  سورۃ الحج (آیات ۳۴ تا ۴۸) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **مطالعۂ حدیث** — 40
  امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس کی اہمیت — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **تذکّر و تدبّر** — 61
  قرآن کریم کی اصولی باتیں (۲) — ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل
- **توضیح وتنقیح** — 71
  کیا ابلیس فرشتوں میں سے تھا؟ — پروفیسر خورشید عالم
- **افکار وآراء** — 77
  ''بیان القرآن'' آسمانِ تفاسیر کا درخشندہ ستارہ — نذر حیات خان
- **کُونُوا مع الصَّادِقِین** — 83
  ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور ان کے رفقاء کے قرآنی احوال اور مبشرات — ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
- **دعوتِ فکر** — 90
  فطرت کے باغی معاشرتی بگاڑ کا اصل سبب — رفیق چودھری

❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

استحکامِ پاکستان کی واحد بنیاد

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

تنظیم اسلامی کراچی کے زیر اہتمام ۲/اگست ۲۰۱۵ء کو فاران کلب‘ گلشن اقبال‘ کراچی میں یومِ آزادی کے حوالے سے ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا‘ جس میں امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ نے ’’استحکامِ پاکستان کی واحد بنیاد‘‘ کے عنوان سے خصوصی خطاب فرمایا۔ ترتیب وتسوید کے بعد یہ خطاب قارئین میثاق کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

معزز سامعین کرام!

ہر سال ۱۴/اگست کو ہم یومِ آزادی مناتے ہیں اور اس موقع پر اجتماعی اور انفرادی سطح پر تقریبات بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم مادر پدر آزاد ہو کر ہلڑ بازی کے سے انداز میں جشن آزادی مناتے ہیں‘ جبکہ آزاد قوموں کا شعار یہ ہوتا ہے کہ وہ اس موقع پر خود احتسابی کے عمل سے گزریں۔ خاص طور پر جو ملک کسی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہو‘ اس کے باشندوں کے لیے تو یہ بات ناگزیر ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

اس سال ۱۴/اگست کو پاکستان کے قیام کو شمسی تقویم کے حساب سے ۶۸ برس مکمل ہو رہے ہیں‘ جبکہ قمری تقویم کے حساب سے ۲۷ رمضان المبارک کو ۷۰ سال مکمل ہو چکے ہیں۔ پاکستان کا قیام نزول قرآن کے مہینے رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو عمل میں آیا تھا اور یہ یقیناً بڑی برکت اور سعادت کی بات ہے‘ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے یومِ آزادی کے لیے ۲۷ رمضان المبارک کو چھوڑ کر ۱۴/اگست کا تعین کیا‘ حالانکہ ماہِ رمضان المبارک کے ساتھ یومِ آزادی کو منسلک کرنے کا یہ فائدہ ضرور ہوتا کہ قیامِ پاکستان کا مقصد غیر شعوری طور پر از خود

ہمارے ذہنوں میں تازہ ہوتا رہتا اور لوگوں کی توجہ اس پر قائم رہتی۔

بہر حال آج کے موضوع کے حوالے سے سب سے پہلے یہ غور کرنا ہوگا کہ کیا ہم واقعتاً عدمِ استحکام کا شکار ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو پھر ہمیں اس بات کا بھی تعین کرنا پڑے گا کہ پاکستان کے استحکام کی بنیاد کیا ہے؟ آیئے جائزہ لیتے ہیں کہ آیا ہم عدمِ استحکام کا شکار ہیں یا نہیں؟ اس کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے ہمیں جس ملک سے اپنا موازنہ کرنا چاہیے‘ وہ بھارت ہے۔ اس لیے کہ ۱۹۴۷ء تک پاکستان اور بھارت ایک ہی ملک تھے جس پر باہر کی ایک قوم انگریز نے آ کر قبضہ کر رکھا تھا اور یہاں کم وبیش سو سال تک حکمرانی کی تھی۔ ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ یہاں دیگر قومیں بھی ان کی محکوم تھیں۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ مسلمان اگرچہ یہاں اقلیت میں تھے‘ لیکن انگریز کی آمد سے پہلے یہاں آٹھ سو برس تک مسلمانوں کی حکومت رہی تھی اور انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا‘ چنانچہ وہ اپنا اصل دشمن مسلمانوں ہی کو سمجھتا تھا۔ یہ اگرچہ ایک ضمنی بحث ہے‘ لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ جب ہندوستان کو انگریز سے آزادی ملی تو تقسیم کے نتیجے میں اسی خطے میں ایک نیا ملک پاکستان کے نام سے وجود میں آیا۔ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء سے قبل پاکستان نام کا کوئی ملک دنیا کے نقشے پر نہ تھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے نتیجے میں دونوں ملکوں یعنی بھارت اور پاکستان نے بیک وقت ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔ لہٰذا اس وقت تو ہمیں اپنا موازنہ بھارت کے ساتھ کرنا ہے‘ اگر ہم خود احتسابی کے عمل سے گزرنا چاہیں۔

سیاسی اعتبار سے ہم ان کے مقابلے میں انتہائی نابالغ ثابت ہوئے ہیں۔ وہ قوم اس اعتبار سے زخم خوردہ تھی کہ ان کا ملک‘ جسے وہ ’’مہا بھارت‘‘ کہتے تھے‘ دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ ان کی سوچ کے مطابق ان کی ’’دھرتی ماتا‘‘ کو چیر کر پاکستان قائم کیا گیا تھا۔ ان کا وہ زخم آج بھی تازہ ہے۔ بہر حال جیسے ہی ان کا ملک آزاد ہوا‘ انہوں نے سیاسی بالغ نظری کا ثبوت دیا اور جاگیرداری کے نظام کو فوراً ختم کر دیا۔ اس وقت سے ان کی سیاسی گاڑی جمہوریت کی پٹڑی پر‘ جسے آج کے زمانے میں بہترین سیاسی نظام سمجھا جاتا ہے‘ رواں دواں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جمہوری نظام کو چلا کر دکھایا ہے۔ ہم کس درجے سیاسی نابالغ ثابت ہوئے ہیں‘ اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بار بار مارشل لاء کا لگ جانا اور پھر سیاسی جماعتوں اور قیادتوں کی غیر جمہوری سوچ‘ ان کی ذہنیت کی پستی‘ ان کی ترجیحات اور ان کے مجموعی عملی

رویّے بھی ہماری اسی سیاسی عدمِ بلوغت کا منہ بولتا ثبوت ہیں جس پر مجھے مزید کچھ تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح معاشی اعتبار سے دیکھا جائے تو آج بھارت دنیا میں ایک منی سپر پاور بن چکا ہے‘ جبکہ اس کے مقابلہ میں پاکستان کی حالت غلاموں جیسی ہے۔ ہم آزادی تو مناتے ہیں‘ لیکن حقیقت میں ہم ایک غلام قوم ہیں۔ بظاہر ہمیں سیاسی آزادی حاصل ہے‘ مگر ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ ہم کس کے دست نگر ہیں اور ہمارے بارے میں قومی فیصلے کون کرتا ہے۔ کون سے آسمان سے یہ فیصلے نازل ہوتے ہیں کہ اب کس جماعت یا شخصیت کو تختِ حکومت پر متمکّن ہونے کا موقع دیا جائے‘ کسے این آر او کے چشمے سے دھلا کر اوپر بٹھانے کا اہتمام کیا جائے‘ کب ملٹری حکومت لائی جائے اور کب لوگوں کی تسلّی و تشفّی کے لیے جمہوریت کا ڈرامہ رچایا جائے! یہ سب اس بات کا مظہر ہے کہ ہم حقیقت میں غلام ہیں۔ بطور نمونہ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ایک وقت وہ بھی آیا تھا جب معین قریشی کو امریکہ سے براہِ راست وزیراعظم بنا کر بھیجا گیا تھا‘ حالانکہ اس وقت بعض اہم ذرائع کے مطابق ان کے پاس پاکستانی شہریت کے حوالے سے شناختی کارڈ تک نہ تھا۔ پھر ان کا شناختی کارڈ دورانِ سفر ہی بنا دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آسمانِ واشنگٹن نے پاکستان میں سیاسی قیادت کے حوالے سے فیصلہ کر دیا تھا جو ہم تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ اس میں کیا شک ہے کہ سیاسی اعتبار سے ہم امریکہ کے غلام ہیں اور معاشی اعتبار سے ہم پورے طور پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جشن آزادی منانے میں ہم بعض دوسری قوموں سے بہت آگے ہیں‘ لیکن حقیقتاً ہم ابھی بھی غلام ہیں۔ ہماری یہ غلام حکومتیں بالعموم ذاتی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہوتی ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ تو لوگوں کو پہلے بھی تھا‘ لیکن اب جو کرپشن کے حوالے سے حقائق کھل کر سامنے آئے ہیں تو وہ ہوش اڑا دینے والے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں‘ الا ماشاء اللہ۔ عوام ظلم کی چکّی میں بھلے پِس رہے ہوں‘ لیکن آئی ایم ایف کا حکم ہوگا تو بجلی اور گیس کی قیمتیں لازماً بڑھا دی جائیں گی۔ ہم کُلّی طور پر اُن کے رحم و کرم پر ہیں اور ہمارے سارے فیصلے وہی کرتے ہیں۔

وحدتِ ملی کے اعتبار سے ہمارے استحکام کی پوزیشن یہ ہے کہ اس وقت ہم ایک قوم‘ ایک وحدت اور ایک ملت نہیں ہیں‘ بلکہ ہم مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی ایک ایسی قوم ہیں جو مختلف

عصبیتوں کی بنیاد پر باہم دست و گریباں ہے۔ حالانکہ کسی بھی ملک میں استحکام ہمیشہ وحدتِ ملی سے پیدا ہوتا ہے اور جس قوم میں وحدت نہ ہو وہ عدمِ استحکام کا ہی شکار رہتی ہے۔

ملکی استحکام کا ایک پیمانہ قانون کی بالادستی بھی ہے۔ آج یورپی ممالک کو دیکھ لیں کہ ان کے اندرونی استحکام کی ایک اہم بنیاد قانون کی حکمرانی ہے۔ اس حوالے سے ہمارا جو بدترین حال ہے اس پر سوائے مرثیہ پڑھنے کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ اب قانون کو اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ایک طرف رکھ کر کوشش کی جا رہی ہے کہ شہرِ قائد میں رینجرز کے ذریعے مجرموں کی گرفت کی جائے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک مصنوعی نظام ہے جسے عام طور پر پسندیدہ قرار نہیں دیا جاتا‘ لیکن ہماری مجبوری ہے‘ اس لیے کہ ہمارا موجودہ ملکی نظام جس کو بچانے کے لیے متحارب سیاسی جماعتیں بھی اپنے ذاتی و گروہی مفادات کی خاطر ایک وحدت بن جاتی ہیں‘ اس درجے فرسودہ ہے اور اتنا گل سڑ چکا ہے کہ اس سے خیر کی کوئی توقع نہیں۔

اخلاقی اعتبار سے اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو ہم اخلاقی دیوالیہ پن کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ حدیث مبارکہ میں منافقین کی جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں‘ بدقسمتی سے ہماری قوم میں وہ تمام کی تمام موجود ہیں‘ جو ہمارے اخلاقی افلاس کا نتیجہ ہے۔ جھوٹ بولنا ہمارے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ہم میں سے ہر شخص‘ الا ماشاء اللہ‘ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جھوٹ بولنے اور غلط بیانی کو اپنا جائز حق سمجھتا ہے۔ جھوٹ کو آج کل گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا‘ بلکہ اسے عقل مندی اور ہوشیاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ خلافی‘ بددیانتی‘ امانت میں خیانت وہ امراض ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ جس شخص میں یہ خصلتیں موجود ہوں تو وہ پکا منافق ہے۔ اللہ ہمیں نفاق سے بچائے‘ لیکن عملاً منافقت کی تمام نشانیاں ہمارے معاشرے میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ بالخصوص جو لوگ ہمارے ہاں اقتدار کے حوالے سے جتنے بلند منصب پر ہیں‘ ان میں یہ منافقانہ خصلتیں اتنی ہی زیادہ نظر آتی ہیں‘ اِلّا ماشاء اللہ۔ لہٰذا کسی بھی طور سے ہمارے اندر قومی سطح پر استحکام دور دور تک نظر نہیں آتا۔

۱۹۴۷ء میں ہم دنیا کے سامنے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے متعارف ہوئے تھے‘ لیکن آج ہم ہر اعتبار سے غلام بن چکے ہیں‘ آزاد قوموں کے اوصاف میں سے کوئی وصف ہم میں نظر نہیں آتا۔ علامہ اقبال نے اپنی فارسی شاعری میں عظمت انسانی کی حامل شخصیت یعنی ’’وجودِ مصدّقہ‘‘ اور اس کی صفات کا تذکرہ کیا ہے۔ علامہ کے نزدیک وجودِ مصدّقہ

(Authentic being) کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ اللہ کی نظر میں میرا کیا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اپنے کو جانچنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ قرآن وحدیث کے مطابق اللہ کے پسندیدہ بندوں میں کون کون سے اوصاف ہوتے ہیں اور وہ اوصاف مجھ میں ہیں یا نہیں؟ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہ سے دیکھے کہ دوسرے لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ یعنی ع ''کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا''۔ تیسری صفت یہ ہے کہ وہ اپنے افعال واعمال کے بارے میں خود وقتاً فوقتاً تنقیدی جائزہ (critical analysis) لیتا رہے اور اپنی خامیوں کی اصلاح پر کمربستہ رہے۔ مذکورہ تین صفات سے متّصف شخص یا قوم وجودِ مصدّقہ کہلانے کے لائق ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی بحیثیت مجموعی مذکورہ تینوں زاویوں سے اپنے آپ کو پرکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہمارا کیا مقام ہے' لوگ ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور ہمارا ضمیر ہمارے بارے میں کیا کہتا ہے۔

آیئے' جائزہ لیں کہ لوگ ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ جب تقسیمِ ہند کو چالیس برس مکمل ہوئے تو لندن ٹائمز کے ایڈیٹر نے اپنے اداریہ میں لکھا کہ ایک زمانے میں ہندوستان میں ہماری حکومت تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جب ہم نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کیا تو وہاں دو ملک وجود میں آئے' ایک ہندوستان اور دوسرا پاکستان۔ ایڈیٹر لکھتا ہے کہ تقسیم کے وقت یعنی ۱۹۴۷ء میں ہمارے اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا کہ اس وقت سرزمین ہند میں جو دو ملک وجود میں آگئے ہیں' میری دانست میں ان میں سے ایک کا مستقبل بہت روشن ہے اور دوسرے کا مستقبل بہت ہی تاریک ہے۔ پاکستان کے عوام کی غالب اکثریت چونکہ ایک نظریے پر قائم ہے' لہٰذا اس ملک کو ترقی کی دوڑ میں آگے جانے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ دوسری طرف ہندوستان مسائلستان ہے' اس لیے کہ وہاں بے شمار قومیں' لاتعداد مذاہب اور زبانیں ہیں اور اس کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے۔ چالیس سال کے بعد اسی اخبار کا ایڈیٹر لکھتا ہے کہ حیرت انگیز معاملہ یہ ہے کہ آج یعنی اگست ۱۹۸۷ء کو صورتحال اس کے برعکس ہے' سمجھ میں نہیں آتا ایسا کیسے ہوا! پاکستان اس عرصے میں دولخت ہو چکا ہے اور بے شمار بحرانوں کا شکار ہے' جبکہ انڈیا ترقی کی راہ پر گامزن ہے!!

اب ۱۹۸۷ء کے بعد جو مزید عرصہ گزرا ہے تو صورتحال مزید خرابی کی طرف گامزن ہے۔ بھارت اس علاقے کی منی سپر پاور بن چکا ہے۔ دنیا میں اس کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ معاشی اعتبار سے وہ بہت مستحکم ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ہمیں اہلِ پاکستان کو

بے شمار وسائل اور نعمتوں سے نواز رکھا ہے لیکن آج بھوک اور خوف کا عذاب ہم پر مسلّط ہے۔ ہم ہمیشہ دنیا کے سامنے اپنا کشکول پھیلائے رہتے ہیں۔ بلا استثناء کوئی بھی حکومت ہو' خواہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی' ہم قرض دینے والے عالمی اداروں کی شرائط پر قرضہ لیتے ہیں اور ان کے ہر حکم کو ماننے پر مجبور ہیں۔ دوسری طرف وہی قرض دینے والے ادارے بھارت سے یہ کہتے ہیں کہ ہم آپ کو فلاں فلاں شعبے میں قرض دینا چاہتے ہیں۔ بھارت کو اول تو قرض کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر قرض لینا بھی ہو تو وہ اپنی شرائط پر قرض لیتا ہے' جبکہ ہم انہی عالمی مالیاتی اداروں کی سخت ترین شرائط کو بھی ماننے پر مجبور ہیں' اس لیے کہ ہم عملاً معاشی طور پر کنگال ہو چکے ہیں اور ہر وقت اس اندیشے میں گرفتار رہتے ہیں کہ عالمی سطح پر ہمیں دیوالیہ قرار نہ دے دیا جائے۔

ملکی سطح پر ہمارے عدم استحکام کا ایک بہت بڑا ثبوت تو وہ شکست وریخت ہے جو ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کی صورت میں ہمارے لیے بدترین ہزیمت کا موجب بنی اور ہمارا ایک بازو ہم سے کٹ کر جدا ہو گیا' جسے آج ہم بھلا چکے ہیں۔ پھر ہمارے ملک پر تقسیم کے خطرات ہمیشہ منڈلاتے رہتے ہیں۔ بلوچستان میں علیحدگی پسند تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ ماضی قریب میں وہاں پاکستان کا نام لینا اور اس کا پرچم لہرانا بھی جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ کبھی سندھ میں علیحدگی پسند متحرک ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ' برطانیہ اور اس ملک کی ایک بڑی سیاسی قوت' جس کا سربراہ ایک طویل عرصے سے لندن میں مقیم ہے' مل کر پاکستان کو توڑنے کی سازش کر رہے ہیں۔ چند سال قبل یہ بات ذوالفقار مرزا نے کہی تھی جب وہ ایک مرتبہ پھٹ پڑے تھے۔ انہوں نے قوم کو انتباہ کیا تھا کہ یہ سازش تیار ہو چکی ہے اور اب آخری مرحلہ میں ہے۔

اس حوالے سے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم دوسروں کی نگاہ میں کیا ہیں۔ کبھی ہمیں ناکام ریاست کہا جاتا ہے اور کبھی بڑی طاقتیں ہمیں عالمی سطح پر اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کرتی ہیں اور وقتی طور پر مکارانہ انداز میں ہم پر دست شفقت رکھ کر ہمیں بے وقوف بناتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ہمیں بہت سے اعتبارات سے ناکام ریاست قرار دے چکے ہیں۔ ان کے کہنے کی بھی ضرورت نہیں' اگر ہم اپنا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہم ہر اعتبار سے واقعی ایک ناکام ریاست ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف کرنا آج شاید قومی غیرت وحمیّت کے برعکس قرار پائے گا' لیکن حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔ تاہم ہمارا قومی رویّہ اقبال کے اس شعر کے مصداق ہے کہ ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے کبھی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

چنانچہ پاکستان کو توڑنے کے لیے سازشوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ خاکم بدہن' اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔ اللہ تعالیٰ ان دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنائے جو اپنے خیال میں پاکستان کو کئی حصوں میں منقسم دیکھ رہے ہیں اور وہ اپنے اس تخیل کو میڈیا کے ذریعے پیش بھی کرتے رہتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی نگاہ میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اپنے آپ کو ہم کچھ بھی سمجھیں' لیکن ہم میں جو افراد دروں بینی کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ خود اپنے ملک پر تنقیدی نگاہ ڈال سکتے ہیں وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ پاکستان کا معاملہ خاص ہے۔ سورۃ الانفال کی ایک آیت کے مطابق تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس آیت میں ذکر ہی پاکستان کا ہے۔ فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٦﴾﴾

''اور یاد کرو جبکہ تم تھوڑی تعداد میں تھے اور زمین میں دبا لیے گئے تھے' تمہیں اندیشہ تھا کہ لوگ تمہیں اُچک لے جائیں گے تو اللہ نے تمہیں پناہ کی جگہ دے دی اور تمہاری مدد کی اپنی خاص نصرت سے اور تمہیں بہترین پاکیزہ رزق عطا کیا' تاکہ تم شکر ادا کرو۔''

دیکھئے' مسلمان مکّہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تھے جو اللہ کا ایک بہت بڑا کرم تھا۔ مکّہ میں ان پر قافیۂ حیات تنگ کر دیا گیا تو اللہ نے انہیں مدینہ کی صورت میں ایک پناہ گاہ عطا فرما دی۔ اس وقت کوئی مسلمان اتنی عظیم پناہ گاہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس آیت میں ان حالات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے کہ وہ وقت یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے اور زمین میں تمہیں مظلوم بنا کر رکھا گیا تھا اور تمہیں اندیشہ تھا کہ لوگ تمہیں اُچک لے جائیں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے تمہیں مدینہ منورہ جیسی محفوظ ترین پناہ گاہ عطا کی۔

اس آیت کے تناظر میں ہم اپنی حالت پر غور کریں کہ تقسیم ہند سے پہلے یہاں مسلمانوں کا کیا حال تھا۔ ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ انگریز کے جانے کے بعد برصغیر میں ہمارا کردار کیا ہوگا۔ جب انگریز آیا تھا تو ہم حاکم تھے اور اب وہ ان حالات میں جا رہا تھا کہ

ہندو اب بہت برتر پوزیشن میں تھا۔ اب جمہوریت کو بنیاد بنا کر ہندوؤں کو یعنی کانگریس کو اقتدار سونپنے کی بات ہو رہی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں' لہٰذا اب اقتدار جمہوری نظام کے ذریعے ہندو کے ہاتھ میں آنے والا تھا۔ مسلمان اس وقت انگریزوں اور ہندوؤں کی دوہری غلامی میں پس رہے تھے۔ اب تو وہ لوگ تقریباً ناپید ہو چکے ہیں جنہیں معلوم تھا کہ ایک طرف انگریز مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتا تھا اور پھر انگریزوں نے ہی ہندوؤں کے دل میں یہ بات ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے اصول کے تحت ڈالی تھی کہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک اپنی حکمرانی کے ذریعے تمہارا استحصال کیا ہے' لہٰذا اب بدلہ لینے کا وقت ہے۔ انگریزوں نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف شدت پسندانہ جذبات اُبھارے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اندرا گاندھی نے سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر صاف طور پر کہا تھا کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لے لیا ہے۔

اس سارے پس منظر میں مسلمانوں کا مستقبل اُس وقت بہت تاریک نظر آ رہا تھا اور ﴿تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ﴾ ''تمہیں اندیشہ تھا کہ تمہیں اچک لیا جائے گا'' کے مصداق مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں زور پکڑ چکی تھیں۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ یہ مسلمان ہمارے ہی لوگ ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے' لیکن ان کے طور طریقے تو ہندوانہ ہی ہیں' تو ان کو واپس اپنے مذہب میں لے آؤ! اس کے لیے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں چلائی گئیں۔ ان تحریکوں کے خلاف تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاسؒ اور دیگر رجالِ قوم نے تبلیغ اسلام کے ذریعے بند باندھا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو دین سکھا کر ہندوؤں کی سازش کو ناکام بنایا' ورنہ مسلمان تیزی سے ہندومت کی طرف واپس جا رہے تھے۔ آج بھی بی جے پی کا نعرہ ہے کہ ''مسلمان کے دو استھان: پاکستان یا قبرستان!''

ان سخت ترین حالات میں ﴿فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ﴾ ''پس اللہ نے تمہیں ایک پناہ گاہ عطا فرما دی اور اور تمہاری مدد کی اپنی خاص نصرت سے'' کے مصداق پاکستان کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ایک پناہ گاہ عطا کر دی۔ مکہ کے مسلمانوں کی پناہ گاہ مدینہ منورہ بنی اور کیا زبردست پناہ گاہ اللہ نے عطا فرمائی تھی۔ بعینہٖ اسی طرح مسلمانانِ برصغیر کو پاکستان کی صورت میں پناہ گاہ عطا فرمائی۔ نئی نسل کو تو ان حقائق کا پتا نہیں ہے' کیونکہ ہمارے ہاں تاریخ تنقیدی انداز میں پڑھائی نہیں جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اللہ کی غیبی مدد سے قائم ہوا تھا۔ عام

مادی قوانین کے تحت پاکستان کا بننا ناممکن تھا۔

ایک اور پہلو سے دیکھ لیجیے۔ سیاسی سطح پر کانگریس ایک بہت مضبوط جماعت تھی اور مسلم لیگ کا اس کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ کانگریس اگرچہ پورے ہندوستان کے ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تھی' لیکن اس میں غیر ہندو اقوام بلکہ مسلمانوں کی نمائندگی بھی نمایاں طور پر موجود تھی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے بعض بڑے بڑے اکابر اس میں شامل تھے۔ گویا اس میں ہندوستان کے تمام طبقات کی مؤثر نمائندگی موجود تھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اگرچہ بہت بڑے سرمایہ دار خاندان کا فرد تھا' لیکن سیاست میں آنے کے بعد اس نے مکمل عوامی سطح پر زندگی گزاری' جبکہ دوسری طرف مسلم لیگ نوابوں اور وڈیروں کی جماعت ہوا کرتی تھی اور اس کی سیاست ۱۹۳۰ء تک محض ڈرائنگ روموں تک محدود تھی۔ تحریک پاکستان جب آگے بڑھی ہے تو عوام میں اس کی پذیرائی ہوئی' ورنہ اس کی کوئی سیاسی حیثیت نہ تھی۔ اس عوامی پذیرائی کی وجہ وہ مقبول نعرہ تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ''۔ اس نعرہ نے لوگوں میں آگ بھر دی تھی۔ دوسری طرف مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بھی نہیں تھی۔ احرار اور خاکسار الگ تھے اور علماء ہند کا ایک بڑا طبقہ بھی الگ تھا۔ اس زمانے میں علماء کا عوام پر بڑا اثر ہوتا تھا۔ لیکن چند بڑے علماء کو چھوڑ کر علمائے دین کی عظیم اکثریت نے بالعموم تحریک پاکستان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ جیسے ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے مسلمانوں کی حکومت تھی' اب انگریز کے جانے کے بعد مسلمان پھر سے حکومت پر قابض ہو جائیں گے' لہٰذا ہمیں ایک چھوٹا سا خطہ لینے کی بجائے ہندوستان کا حصہ بن کر ہی رہنا چاہیے۔ اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اب حالات مکمل طور پر بدل چکے تھے جن کا انہیں ادراک نہ تھا۔ پھر ہندوستان کا حکمران طبقہ یعنی انگریز اور دوسرا اکثریتی طبقہ یعنی ہندو دونوں پاکستان کے قیام کے خلاف تھے۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے مکہ کے مسلمانوں کے لیے مدینہ کی طرح ہمیں بھی پاکستان کی صورت میں ایک پناہ گاہ میسر فرمائی اور اس مملکت کو اللہ کی تائید حاصل ہوئی اور آج بھی ان کٹھن حالات میں ہمیں یہ تائید حاصل ہے۔ گویا پاکستان کا وجود اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی کا مرہونِ منت ہے۔

مزید فرمایا: ﴿وَرَزَقْكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ﴾ ''اور تمہیں بہترین پاکیزہ رزق عطا کیا''۔ مسلمانانِ مکہ کی طرح کیا ہمیں بھی اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ رزق کے ذرائع عطا نہیں فرمائے؟ ہمارے ملک میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ہر طرح کا موسم' انواع و اقسام کے پھل'

سبزیاں اور بے پناہ معدنی دولت سب کچھ ہمیں میسّر ہے۔ یہ سب کچھ ہمیں اس لیے ملا' تاکہ ہم اُس کا شکر بجا لائیں۔ انگریز اور ہندو سے قانونی سطح پر جنگ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں محمد علی جناح جیسا قائد عطا فرمایا جس کے کردار کی عظمت کو دنیا تسلیم کرتی ہے۔ انہیں قائداعظم اور معمارِ پاکستان غلط نہیں کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کام لیا اور وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے پاکستان کو ایک حقیقت کا روپ دے سکے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم اپنے نعرے ''پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ'' کو عملی شکل دیتے اور وطن عزیز میں اللہ کے کلمے کو سربلند کرتے اور یہاں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی نافذ کرتے۔ اسی طرح ہم اللہ کا شکر ادا کرنے کے قابل ہو سکتے تھے' لیکن افسوس کہ ہم نے ایسا نہیں کیا۔

اس ضمن میں ایک اور آیت کا حوالہ پیش خدمت ہے' سورۂ یونس میں فرمایا:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴﴾

''پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں جانشین بنا دیا' تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو!''

اللہ تعالیٰ جب کسی کو اقتدار اور غلبہ عطا کرتا ہے تو اس کا مقصد آزمائش ہوتا ہے۔ یہ اہلِ حق کے لیے امتحان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی یہ ملک عطا کیا' لیکن ہم اس امتحان میں ناکام ثابت ہوئے۔ ہم نے اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو نافذ کرنے کے سوا سب کچھ کیا اور ہم نے ناشکری کی انتہا کر دی۔ آج پاکستان کے قیام کو قمری کیلنڈر کے اعتبار سے ۷۰ سال ہو چکے ہیں' لیکن اس ملک میں اللہ کا دین قائم نہیں ہے۔ انگریز نے جو قوانین ۱۸۹۵ء میں بنائے تھے' پورا ملک ان قوانین پر آج بھی چل رہا ہے۔ پاکستان کا عدالتی نظام ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت چل رہا ہے۔ ہم نے ان قوانین کی مقدس گائے کی طرح حفاظت کی ہے۔ اسلامی نظام کے کامل و مکمل ہونے کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں' لیکن عملاً اسے پاؤں تلے روند رکھا ہے۔ اگر پورا برصغیر ایک وحدت کی صورت میں آزاد ہوتا تو یقیناً ہندو اکثریت میں ہوتا۔ اس کے علاوہ بھی کئی غیر مسلم اقلیتیں تھیں۔ اس صورت میں تو معذرت پیش کی جا سکتی تھی کہ ہم کیسے اسلامی نظام نافذ کریں جبکہ ہم یہاں اقلیت میں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کی راہ میں کون سی رکاوٹ ہے؟ اللہ کا دین یہاں کیوں نہیں نافذ ہوا؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس کو اولین ترجیح دی ہی نہیں گئی' اس کا ذکر ہی نہیں ہوتا کہ یہاں دین کا نفاذ ہماری ذمہ داری ہے اور اس کے بغیر

ہم اللہ کی نگاہ میں مجرم ہیں۔

میں علماء سے بھی دست بستہ عرض کروں گا کہ وہ اس پر غور کریں کہ ہم اللہ کی نگاہ میں کہاں کھڑے ہیں۔ سورۃ المائدۃ میں جو فتوے آئے ہیں کہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر‘ ظالم اور فاسق ہیں‘ کیا وہ فتوے آج پاکستانی قوم پر پوری طرح صادق نہیں آتے؟ ایک قوم جو مسلمان بھی ہو اور اکثریت میں بھی ہو‘ پھر بھی قرآن کے عطا کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کرے‘ یہ فتوے یقیناً انہی کے لیے ہیں۔ اور یہ صوفی محمد یا کسی عالم کے نہیں‘ بلکہ اللہ ربّ العزت کے فتوے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اس قوم پر ذلّت اور مسکنت کا عذاب مسلّط ہے۔ ذلت کا لفظ کمزوری کے لیے بھی آتا ہے اور تذلیل کے لیے بھی۔ بات کہتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے‘ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں عمومی طور پر تمام مسلمان ذلت و مسکنت کے عذاب کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قانون سورۃ البقرہ اور سورۂ آل عمران میں بیان ہوا کہ جب سابقہ اُمت یہود نے اپنی دینی ذمہ داری پوری نہیں کی تو اللہ نے ان پر ذلت و مسکنت کا عذاب مسلط کر دیا اور وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنے۔ آج پوری اُمتِ مسلمہ ہی اللہ کے غضب کا نشانہ بنی ہوئی ہے‘ خاص طور پر بیس کروڑ مسلمانانِ پاکستان جنہیں اللہ تعالیٰ نے اتنا بہترین موقع عطا کیا تھا‘ اپنی غیبی تائید سے یہ ایک آزاد خطہ عطا کیا تھا‘ لیکن ہم نے اس کی ناقدری کی اور آج ہم پر ذلت و مسکنت مکمل طور پر چھائی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے پچھلے دنوں اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ جب آپ پاکستانی گرین پاسپورٹ لے کر کسی بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترتے ہیں تو آپ کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے؟ کیا ہم میں سے کچھ لوگوں کی یہ آرزو نہیں ہے کہ کاش ہمیں کسی بیرونی ملک کا پاسپورٹ مل جائے؟ اپنے دل سے پوچھیں! ہمارا یہ پاسپورٹ دنیا میں ذلت و عبرت کی نشانی ہے۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں دیکھیں تو ہم اللہ کی نگاہ میں آج بدترین مقام پر کھڑے ہیں۔

ایک اور بحث بھی ہے‘ جو اگرچہ طویل ہے‘ لیکن میں اسے مختصر کر دیتا ہوں کہ پاکستان واقعتاً صرف اسلام کے نام پر بنا ہے اور یہ دنیا کا واحد ملک ہے جو نظریاتی بنیادوں پر قائم ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے دانشور اس سب سے بڑی حقیقت کو‘ جو نوشتہ دیوار کی حیثیت رکھتی ہے اور جو آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کی طرح روشن ہے‘ جھٹلانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دو قومی نظریہ کا کوئی وجود نہیں ہے‘ پاکستان اسلام کے نام پر نہیں بنا اور یہ صرف چند

چھوکروں کے نعرے ہیں‘ حالانکہ قائداعظم کے ایک سو سے زیادہ بیانات موجود ہیں جن میں یہ بات بڑی واضح ہے کہ پاکستان کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ وہاں نماز اور دیگر دینی عبادات و شعائر کی آزادی ملے گی‘ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کا دین جو ہر اعتبار سے مکمل ہے‘ دنیا کے سامنے اس نظام کا ایک نمونہ پیش کیا جائے گا تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ اسلامی نظام ایسا ہوتا ہے۔ تاہم اگر اس بحث کو یکسر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ یہ اسلام کے نام پر بنا ہے یا نہیں‘ پھر بھی یہاں چونکہ مسلمانوں کی غالب اکثریت آباد ہے‘ جو کُل آبادی کا ۹۶ فیصد ہے‘ لہٰذا اگر پھر بھی یہاں ہم اللہ کے دین کو قائم نہیں کرتے تو ہم اللہ کی نگاہ میں مجرم شمار ہوں گے۔ اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے نزدیک اللہ کائنات کا خالق ضرور ہے اور اس نے ہمیں ایک آزاد خطہ بھی عطا کیا ہے‘ لیکن ہم اس میں اس ربِّ کائنات کا نظام قائم ہونے نہیں دیں گے! یہ اللہ سے کھلی بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ وہ بغاوت ہے جو ہمیں نظر نہیں آ رہی۔

پاکستان وطنی قومیت کی نفی پر بنا تھا۔ وطنی قومیت جو آج کے دور کا ایک مذہب بن چکا ہے‘ جس کے بارے میں کچھ مسلمانوں نے کہا کہ یہ بھی اسلام کے ساتھ مطابقت رکھنے والی ایک سوچ ہے۔ علامہ اقبال جو اپنے دور کے براہیمی نظر رکھنے والے انسان تھے‘ انہوں نے اس پر کاری ضرب لگائی ہے۔ قائداعظم‘ علامہ اقبال کو مصورِ پاکستان مانتے ہیں۔ انہیں حکمرانوں سمیت پوری قوم نے حکیم الامت کا لقب بھی دیا ہے اور انہوں نے وطنی قومیت پر وہ تیشہ چلایا جو آج تک کسی نے نہیں چلایا۔ فرماتے ہیں:

اس دور میں مے اور ہے‘ جام اور ہے‘ جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

یہ ملک وطنی قومیت کی اس قدر نفی پر بنایا گیا کہ پنجاب اور بنگال کے علاقوں کو کیک کی طرح کاٹا گیا‘ ورنہ ممالک کی جغرافیائی حدود ہوا کرتی ہیں اور ان کی جغرافیائی حدود قدرتی طور پر بنی ہوتی ہیں۔ وطنی یا علاقائی قومیت کے تصور کے مطابق ایک خاص خطے میں رہنے والی تمام قومیتیں ایک قوم ہوتی ہیں‘ ان کے مذاہب الگ الگ ہوں تو کوئی حرج نہیں‘ وہ اپنی ذاتی زندگی میں اپنے مذہب پر عمل کریں‘ لیکن بحیثیت قوم وہ ایک ہیں۔ اجتماعی نظام کے حوالے سے کسی مذہب کو معیار نہیں بنایا جائے گا بلکہ ایک ہی اسمبلی چلے گی جو عوام کی رائے سے وجود میں آئے گی اور کثرتِ رائے سے قانون سازی کرے گی۔ تمام اجتماعی معاملات کسی بھی مذہب کے حوالے سے طے نہیں ہوں گے بلکہ ارکانِ اسمبلی ہی طے کریں گے۔ بعض ملک ایسے ہیں جو ایک نسل پر مشتمل ہیں‘ کئی ایک زبان پر مشتمل ہیں اور اس بنیاد پر وہ ایک مضبوط قوم شمار ہوتے ہیں۔ جبکہ پاکستان میں کتنی قومیتیں‘ کتنی زبانیں‘ کتنے کلچر ہیں‘ لیکن انہیں جوڑنے والی ایک ہی قوت اسلام ہے۔ اس کو مستحکم کرنے کے لیے کوئی اور دنیوی طریقہ اختیار کیا ہی نہیں جاسکتا۔ علامہ اقبال نے بالکل درست کہا تھا: ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

یعنی اے مسلمان! تمہاری یک جہتی کے لیے وہ بنیادیں نہیں ہیں جو دنیا کی دیگر اقوام کے لیے ہوتی ہیں‘ بلکہ تمہارے لیے واحد بنیادی قوت دین اسلام ہے۔ چنانچہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ ہم اپنی نظریاتی اساس کو مستحکم کریں‘ اسے بنیاد بنائیں‘ تبھی یہ ملک مستحکم ہوگا۔ لیکن ہم تو کدالیں لے کر اس کی بنیادیں منہدم کرنے میں مشغول ہیں۔ پوری قوم اسی کام میں لگی ہوئی ہے۔

میں مختصر کر رہا ہوں‘ ورنہ میں قائداعظم کی بہت ساری تقاریر کا ریکارڈ لے کر آیا تھا کہ ان کے پیش نظر کیا تھا۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا تجزیہ یہ تھا کہ اسلام کے نظامِ عدلِ

اجتماعی کے قیام کی فکر کو علامہ اقبال نے اس قوم میں پھونکا ہے اور قائداعظم کے بیانات میں اسی فکر کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ دین کے جامع تصور سے آگاہ تھے۔ اور یا مقبول جان نے یہ بات تاریخ کے پردوں سے نکالی ہے کہ قائداعظم نے پاکستان کے قیام کے فوراً بعد علامہ اسد کی یہ ذمہ داری لگائی تھی کہ وہ قوانین کو اسلامی بنانے کے لیے کام شروع کر دیں اور سب سے پہلے نظامِ تعلیم کو اسلامی بنانے کا کام کیا جائے۔ علامہ اسد عالم اسلام کی ایک اہم دینی شخصیت تھے اور دنیوی تعلیم کے اعتبار سے بھی ان کا بہت اونچا مقام تھا۔ ان کا پس منظر یہ تھا کہ پہلے وہ یہودی تھے‘ ان کے والد ایک رِبی تھے‘ انہوں نے اسلام قبول کیا اور بڑی امیدوں کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ اور یا مقبول جان کی یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد قائداعظم نے قوانین کو اسلامی بنانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے اس کے لیے عملی راستہ کھول دیا تھا اور علامہ اسد کے زیر نگرانی ایک ''ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن'' قائم کر دیا گیا تھا۔ اس کے چار شعبے بنائے گئے تھے‘ تاکہ نظام کو اسلامائز کیا جا سکے: i) اسلامی ریاست کا ڈھانچہ کیا ہوگا؟ ii) اسلام کا معاشی نظام کیسا ہوگا؟ iii) عدالتی نظام کو کیسے اسلامائز کیا جائے گا؟ iv) اسلام کا تعلیمی نظام کن بنیادوں پر استوار ہوگا؟ علامہ اسد نے اس وقت قائداعظم کو سفارش کی تھی کہ جب تک ہم اپنا نظامِ تعلیم اسلامی اصولوں پر وضع نہ کر لیں‘ بہتر ہوگا کہ تعلیمی اداروں کو بند کر دیا جائے‘ اس لیے کہ ان اداروں سے جو طالب علم پڑھ کر نکلیں گے‘ ان کی ذہن سازی تو ہو چکی ہوگی۔ وہ جو اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا: ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

اور علامہ اقبال نے کہا تھا:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

علامہ اسد نے قائداعظم کے زیر ہدایت قوانین کو اسلامی بنانے کا کام پورے عزم مصمم سے شروع کر دیا‘ لیکن قائداعظم کی وفات کے بعد بیوروکریسی نے ان کے ساتھ سلوک یہ کیا کہ ان کی خدمات محکمہ خارجہ کو منتقل کر دی گئیں اور انہیں مشرقِ وسطیٰ میں وزارتِ خارجہ کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے مامور کر دیا گیا۔ قوانین پاکستان کو اسلامی بنانے کا جو کچھ کام انہوں نے کیا تھا‘ اس

کو بھی ایک سازش کے تحت جلا کر بھسم کر دیا گیا۔ اس ملک میں یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔

اب میں اپنی تقریر کے آخری حصے پر آ رہا ہوں۔ ایک جرم انفرادی ہوتا ہے اور انفرادی طور پر بھی ہمارا حال بہت اچھا نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی بقول علامہ اقبال: ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

میرا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد اب بڑھ چکی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیاداری کی طرف مائل ہونے والوں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ تاہم اصل اہمیت اجتماعی نظام کی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے اس ملک میں اللہ کے دین کو سب سے کم اہمیت دی ہے۔ وہ جو یہود کے بارے میں سورۃ البقرۃ' آیت ۸۵ میں آیا ہے کہ انہوں نے کتابِ الٰہی کے بعض حصوں کو تو حرزِ جان بنایا اور بعض حصوں کو پس پشت ڈال دیا' کہ وہی صورتحال آج ہماری ہے۔

اس ضمن میں' میں اس کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا' ماضی قریب میں دنیا کے ایک خطے میں اللہ کی شریعت مکمل طور پر نافذ ہوئی اور کچھ درویشوں کو اللہ نے یہ توفیق دی کہ وہ ساری دنیا سے ٹکر لیتے ہوئے اللہ کے دین کا پرچم عملاً بلند کر دیں۔ وہ طالبانِ افغانستان تھے' جن کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے ہم نے طاغوتی قوتوں کا ساتھ دیا۔ یہ بہت سنگین جرم ہے۔ عالم اسلام کے ۵۷ ملکوں میں افغانستان واحد ملک تھا جہاں انہوں نے پورا نظامِ حکومت اسلامی بنیادوں پر چلایا اور زندگی کے کسی گوشے کو مستثنیٰ نہیں رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ طالبانِ افغانستان کو بہت بدنام کیا گیا۔ (واضح رہے کہ میں تحریک طالبان پاکستان کی بات نہیں کر رہا 'ان میں تو اسلام دشمن قوتیں بھی شامل تھیں۔) طالبانِ افغانستان کو ختم کرنے کی خاطر ساری عالمی قوتیں اُمڈ کر آ گئیں۔ انہیں تو آنا ہی تھا' لیکن ہم نے ان عالمی قوتوں کا ساتھ دے کر اور ان کا فرنٹ لائن اتحادی بن کر کتنا سنگین جرم کیا ہے' اس پر اللہ کا عرش تھَرتھَرا اُٹھا ہوگا۔ ہمارے اس جرم کا ازالہ صرف اس صورت میں ہوگا جب یہاں ہم اللہ کا دین قائم کر کے دکھائیں گے' ورنہ ہمیں دنیا و آخرت دونوں کی بربادی سے ڈرنا چاہیے۔

پھر یہاں ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگایا گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نعرے میں اسلام کی نفی تھی' اس لیے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ سب سے پہلے اسلام نہیں' بلکہ سب سے پہلے پاکستان! اس جرم کے ارتکاب کے بعد ہمیں اپنا مستقبل بہت تاریک نظر آ رہا ہے۔ اللہ

تعالیٰ بچانے والا ہے اور وہ ہماری توبہ قبول کر سکتا ہے' بشرطیکہ ہم واقعتاً سچی توبہ کریں اور ہم عملاً اسلام کے لیے مستعد ہو جائیں اور کمر ہمت کس لیں۔ ہماری اولین ترجیح اسلام کی سربلندی ہونی چاہیے۔

مسلمانانِ پاکستان سے میری یہی گزارش ہے کہ استحکامِ پاکستان کا ایک ہی راستہ ہے۔ تمام تاریخی شواہد اور تمام زمینی حقائق بتا رہے ہیں کہ استحکامِ پاکستان کی واحد بنیاد اسلام ہے۔ اس کے لیے دینی جماعتوں کو مل بیٹھ کر سوچنا چاہیے کہ اسلام کیسے نافذ ہوگا؟ اشارہ ضرور کروں گا کہ ایک بات ثابت ہوگئی ہے اور دینی جماعتوں پر بھی یہ حقیقت منکشف ہوگئی ہے' اگر نہیں ہوئی ہے تو ہو جانی چاہیے کہ اس ملک کی ستّر (۷۰) سالہ تاریخ شاہد ہے کہ الیکشن اور ووٹ کے ذریعے اس ملک میں اسلام نہیں آ سکتا۔ یہ بات بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ ۱۹۵۶ء کے بعد سے اپنی ساری حیاتِ دنیوی میں دینی جماعتوں پر واضح کرتے رہے ہیں۔ میں اس کے لیے اَن گنت دلائل دے سکتا ہوں' لیکن یہ اس وقت کا موضوع نہیں ہے۔ کیا ستر سال کی تاریخ کی شہادت ہمارے لیے کافی نہیں ہے؟ اس کا نقطۂ عروج وہ تھا جب متحدہ مجلسِ عمل (ایم ایم اے) بنی تھی اور حالات بھی سازگار تھے۔ اس وقت سب سے بڑی تعداد میں اسمبلیوں میں دینی شخصیات موجود تھیں' لیکن اسلام کے حوالے سے ایک انچ بھی پیش رفت نہیں ہوئی۔ پھر اسی زمانے میں وہ ترمیم منظور کی گئی تھی جس کے بارے میں تمام علماء نے کہا تھا کہ یہ خلافِ اسلام اور خدا سے بغاوت ہے' لیکن ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ آپ کو ''تحفظِ حقوقِ نسواں بل'' تو یاد ہی ہوگا۔ اس کے بعد مذہبی سیاسی جماعتوں کا گراف بڑی تیزی سے نیچے آیا اور مسلسل نیچے جا رہا ہے' لیکن اس کے باوجود ان کا الیکشن پالیٹکس میں موجود رہنا ناقابلِ فہم ہے۔ اس ملک کو بچانے کے لیے خدارا سر جوڑ کر بیٹھیں' راستہ بڑا واضح ہے۔

الحمدللہ' بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ایرانی انقلاب کے بعد اس موضوع پر دس خطابات دیے تھے' جو اب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے نام سے کتابی صورت میں موجود ہیں۔ رہنمائی ہمیں نبی اکرم ﷺ کے طریقِ انقلاب سے لینی ہے۔ اور آج کے مخصوص حالات میں' جبکہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمان حکمران ہیں' کیا ان کے خلاف مسلح تصادم ممکن ہے؟ یہ بہت بڑا سوال ہے اور یہ بڑا حساس معاملہ ہے۔ اس کا حل بھی اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ حکمرانوں کے خلاف ایک پُرامن احتجاج کا جو طریقہ پیش کیا گیا ہے اس سے

بہت سی دینی شخصیات نے اتفاق بھی کیا ہے۔ سب مل کر اس راستے کو اختیار کریں یا انتخابی سیاست سے ترکِ تعلق کر کے دین کے نفاذ کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کریں اور مل کر جدّوجہد کا آغاز کریں۔ ورنہ استحکام پاکستان کی خواہش ایک خواب تو رہے گی‘ لیکن اس خواب کو تعبیر نہیں مل سکے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اللہ کے دین‘ اس کے رسول ﷺ اور خود اللہ تعالیٰ کے سچے وفادار بن جائیں۔ آمین!!

علامہ اقبال نے ’’جوابِ شکوہ‘‘ میں جو پیغام دیا‘ وہ یہی تو ہے: ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

اور یہ کہ ؎

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا!

میں مجبور ہوں اس بات کے دہرانے پر کہ ہم نے ان چند ہزار نہتے طالبانِ افغانستان سے کوئی سبق نہیں سیکھا جن کی شرعی حکومت کو مٹانے کے لیے ساری دنیا چڑھ کر آ گئی۔ ایک امریکہ جو دنیا کی واحد سپر پاور کہلاتا ہے‘ وہی بہت کافی تھا۔ اس لیے کہ جو ہتھیار اور ٹیکنالوجی اس کے پاس ہے‘ وہ ہمارے خواب وخیال میں بھی نہیں۔ طالبانِ افغانستان بھلا اس کا تصور کر سکتے تھے؟ لیکن ان کا ایمان ہے کہ بڑا اللہ ہے‘ امریکہ نہیں! امریکہ کے ساتھ ’’نیٹو‘‘ ممالک بھی آ گئے تھے۔ اس پر مستزاد اسلامی ملکوں کی قیادتیں بھی امریکہ کے ساتھ تھیں۔ اس کے بعد ان کا صرف بچ جانا ہی ایک بہت بڑے معجزے سے کم نہیں‘ لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ’’نیٹو‘‘ وہاں سے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے نکلا ہے۔ امریکہ ان معنوں میں اپنی شکست کا اعتراف کر چکا ہے کہ وہ بھیک مانگتا رہا ہے کہ آ کر ہمارے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھ جاؤ! مذاکرات کے لیے بھیک مانگنا اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مذاکرات اس سے کیے جاتے ہیں جو برابر کی قوت کا ہو۔ پہلے تو امریکہ ان کی کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا‘ اور اب سعودی عرب اور پاکستان پر مذاکرات کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ وہ اس وقت بھی اپنی اسٹریٹجی کے مطابق وہاں سے نکلا تو نہیں ہے۔ جنرل حمید گل کا بھی کہنا ہے کہ امریکہ کو شکست ہو چکی ہے اور اب وہ میدان میں نہیں ہے‘ وہ اپنے چند بیسز کے اندر موجود ہے۔ جبکہ اشرف غنی

کی امریکہ سے اپیل ہے کہ خدا کے لیے یہاں سے نہ جاؤ!

پچھلے دنوں ایک صحافی کی ڈائری ’’دنیا‘‘ اخبار میں چھپتی رہی ہے جو وہاں قید تھا۔ اس کا بھی کہنا ہے کہ وہاں بیشتر حصے پر طالبان کا قبضہ ہے‘ اشرف غنی کی حکومت صرف چند بڑے شہروں تک محدود ہے اور وہ بھی امریکہ کے سہارے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ حکومتی اداروں میں انتہائی کرپشن ہے اور سرکاری عدالتوں سے انصاف مل ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ عوام طالبانِ افغانستان کی عدالتوں سے فیصلے کرواتے ہیں‘ وہاں انصاف بغیر رقم خرچ کیے ملتا ہے۔ یہ کوئی مذہبی شخص نہیں ہے جس نے یہ سب کچھ لکھا ہے‘ بلکہ یہ ایک صحافی ہے جو ان میں رہ کر آیا ہے۔ اس ساری صورتحال میں ہمارے لیے سبق ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎

عقل ہے تیری سپر‘ عشق ہے شمشیر تری
میرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری!

اور ’’جوابِ شکوہ‘‘ کا آخری شعر ہے ؎

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

یہی بات قرآن حکیم نے بھی کہی ہے کہ ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ﴾ (الحج: ۴۰) ’’اللہ لازماً ان کی مدد کرے گا جو اُس کی مدد کریں گے‘‘۔ رب کی دھرتی پر طاغوتی نظام دیکھ کر خاموش رہنے والوں کی اللہ مدد نہیں کرتا۔ جو طاغوتی نظام سے پنجہ آزمائی کریں اور اللہ کے نظام کو قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں‘ اللہ ان کی مدد کرتا ہے۔ قرآن میں یہ بات دوٹوک انداز میں مکرر فرمائی گئی ہے کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷﴾ (محمد) ’’اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا‘‘۔ ورنہ دعائیں مانگتے رہو‘ اللہ سنے گا ہی نہیں۔ جب تم اللہ سے بغاوت کی راہ پر گامزن ہو تو وہ تمہاری دعائیں کیسے سنے گا؟ ہم نے تو پاکستان میں اللہ سے بغاوت کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ اگر ہم اللہ کا عطا کردہ نظام قائم کرنے کی جدوجہد سنجیدگی کے ساتھ کریں تو وہ ہماری طرف متوجہ ہو جائے گا اور اس کی مدد لازماً آئے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں رسول اکرم ﷺ سے‘ دین اسلام سے اور خود اللہ سے وفاداری کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الحَجّ

آیات ۳۴ تا ۳۷

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۙ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِى الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

آیت ۳۴ ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ﴾ ’’اور ہر اُمت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک نظام مقرر کیا ہے تاکہ وہ اللہ کا نام لیا کریں ان مویشیوں پر جو اُس نے انہیں عطا کیے ہیں۔‘‘

﴿فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ﴾ ’’تو (جان لو کہ) تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے‘ تو تم اُسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔‘‘

اس کے ہر حکم کو تسلیم کرو اور اس کی مکمل اطاعت قبول کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک طرف تو قربانی دی جا رہی ہو اور دوسری طرف حرام خوری بھی جاری ہو۔ حرام کے مال سے ہی قربانی کے جانور خریدے جائیں اور پھر فوٹو بنوا کر اخباروں میں خبریں لگوائی جائیں۔ یہ سب کچھ اللہ

کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔ اس کو معبود ماننا ہے تو پھر اس کی مکمل اطاعت قبول کرو اور اُس کی حرام کردہ چیزوں میں منہ نہ مارو۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دے دیجیے عاجزی اختیار کرنے والوں کو۔‘‘

’’اِخبات‘‘ کے معنی اپنے آپ کو پست کرنے اور تواضع وانکساری اختیار کرنے کے ہیں۔

آیت ۳۵ ﴿الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ’’وہ لوگ کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز اٹھتے ہیں‘‘

یعنی تواضع اختیار کرنے والے لوگوں کی یہ نشانی ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل خوف سے کانپ اٹھتے ہیں۔ یہ مضمون سورۃ الانفال کی دوسری آیت میں بھی آیا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ’’مؤمن تو بس وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز اٹھتے ہیں۔‘‘

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِى الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ’’اور ان کو جو بھی تکلیف پہنچے اس پر صبر کرنے والے اور نماز قائم کرنے والے ہیں‘ اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔‘‘

آیت ۳۶ ﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ ’’اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں سے بنایا ہے‘‘

قربانی کے جانور خاص طور پر اونٹ بھی اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔

﴿لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ﴾ ’’تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے‘‘

کہ ان کا گوشت تم خود بھی کھاتے ہو اور غرباء کو بھی کھلاتے ہو۔

﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ﴾ ’’تو تم ان پر اللہ کا نام لو انہیں صفوں میں کھڑا کر کے۔‘‘

صَوَافّ‘ صافَّة کی جمع ہے‘ یعنی صف میں کھڑے ہوئے۔ یہ اونٹوں کی قربانی کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ انہیں قبلہ رو صف بستہ کھڑے کر کے نحر کرو۔ چونکہ اونٹ کو گرا کر ذبح کرنا بہت مشکل ہے‘ اس لیے کھڑے کھڑے ہی اس کی گردن میں برچھا مارا جاتا ہے۔ اس سے اس کی

گردن کی بڑی رگ سے خون کا فوارہ چھوٹتا ہے اور جب زیادہ خون نکل جاتا ہے تو وہ خود بخود نیچے گر پڑتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے سو اونٹوں کی قربانی دی تھی‘ جن میں سے تریسٹھ اونٹوں کو آپ ﷺ نے اسی طریقے سے خود اپنے دستِ مبارک سے نحر فرمایا تھا۔ حضور ﷺ جونہی ایک اونٹ کو برچھا مارتے تھے اگلا اونٹ فوراً اپنی گردن حاضر کر دیتا تھا۔ گویا آپ ﷺ کے ہاتھوں ذبح ہونا ان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا: ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

یہ شعور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ اونٹ تو پھر جاندار ہے‘ اللہ تعالیٰ نے تو ایک سوکھی لکڑی کو ایسا شعور عطا فرما دیا تھا کہ وہ حضور ﷺ کے فراق میں بے قرار ہو کر رونے لگ پڑی تھی۔ یہ ایمان افروز واقعہ احادیث میں تفصیل سے بیان ہوا ہے‘ جس کا خلاصہ یوں ہے کہ شروع شروع میں مسجد نبویؐ کے اندر حضور ﷺ جس جگہ پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے وہاں کھجور کا ایک خشک تنا موجود تھا۔ آپؐ خطبہ کے لیے کھڑے ہوتے تو اس کے ساتھ ٹیک لگا لیتے۔ بعد میں اس مقصد کے لیے جب منبر بن گیا تو آپؐ نے اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا پسند فرمایا۔ لیکن جب آپؐ پہلے دن منبر پر تشریف فرما ہوئے تو اس خشک لکڑی سے ایسی آوازیں آنا شروع ہو گئیں جیسے کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو۔ یعنی وہ خشک لکڑی اپنی محرومی پر رو رہی تھی کہ آج کے بعد اسے حضور ﷺ کی معیت نصیب نہیں ہو گی۔ اس روز سے اس کا نام ’’حنّانہ‘‘ (رقت والی) پڑ گیا۔ بعد میں اس جگہ پر ایک ستون تعمیر کر دیا گیا‘ جو ’’ستونِ حنّانہ‘‘ سے موسوم ہے۔ مولانا رومؒ نے اپنے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے: ؎

فلسفی کو منکرِ حنّانہ است
از حواسِ انبیاء بیگانہ است

کہ فلسفی کو ’’حنّانہ‘‘ جیسے معاملہ کی سمجھ نہیں آ سکتی‘ اس لیے کہ وہ انبیاء کے مقام و مرتبہ سے واقف نہیں ہے۔ وہ تو انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی عام لوگوں پر ہی قیاس کرتا ہے۔ ایک عقلیت پسند شخص تو ایسے واقعہ کو تسلیم کرنے سے فوراً انکار کر دے گا۔ سرسید احمد خاں بھلا کیسے تسلیم کرتے کہ ایک سوکھی لکڑی سے رونے کی آواز آ سکتی ہے۔ بہرحال پرانے زمانے میں ایسی باتوں کا انکار فلسفی کیا کرتے تھے‘ آج کل سائنس دان اور عقلیت پرست دانشور ان باتوں کے منکر ہیں۔

﴿فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا﴾ ’’تو جب ان کے پہلو زمین پر ٹک جائیں‘‘

جب خون بہنے سے اونٹ کمزور ہو جاتا ہے تو پھر وہ ایک طرف کو اپنی کروٹ کے بل زمین پر گر پڑتا ہے۔

﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ﴾ ’’تو اب اس میں سے خود بھی کھاؤ اور قناعت سے بیٹھ رہنے والے اور سوال کرنے والے کو بھی کھلاؤ!‘‘

ایسے مواقع پر ان سفید پوش ناداروں کو بھی مت بھولو جو اپنی خودداری اور قناعت کے سبب کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان محتاجوں کو بھی کھلاؤ جو اپنی محرومی کے ہاتھوں بے قرار ہو کر مانگنے کے لیے آپ کے پاس آ گئے ہیں۔

﴿كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾ ’’اسی طرح ہم نے ان کو تمہارے لیے مسخّر کر دیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔‘‘

اونٹ اتنا بڑا جانور ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے لیے اس انداز سے مسخّر کر دیا ہے کہ تم اسے برچھا مار کر نحر کر لیتے ہو اور پھر اس کا گوشت کھاتے ہو۔ اس کے لیے تم پر لازم ہے کہ تم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو۔

آیت ۳۷ ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ﴾ ’’اللہ تک نہ تو ان کے گوشت پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون‘ لیکن اس تک پہنچتا ہے تمہاری طرف سے تقویٰ۔‘‘

قربانی کا اصل فلسفہ یہی ہے‘ بلکہ ہر عبادت کا فلسفہ یہی ہے۔ کسی بھی عبادت کا ایک ظاہری پہلو یا ڈھانچہ ہے اور ایک اس کی روح ہے۔ ظاہری ڈھانچہ اپنی جگہ اہم ہے اور وہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر اس عبادت کا بجالانا ممکن نہیں‘ لیکن یہ ظاہری پیکر اصل دین اور اصل مقصود نہیں ہے۔ کسی بھی عبادت سے اصل مقصود اس کی روح ہے۔ اسی نکتہ کو علامہ اقبال نے ان اشعار میں واضح کیا ہے: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں‘ روحِ بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا‘ تلقینِ غزالیؒ نہ رہی

اور ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں، تُو باقی نہیں ہے!

چنانچہ قربانی کا اصل مقصود ہمارے دلوں کا تقویٰ اور اخلاص ہے۔ اللہ کے ہاں جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص قربانی دے رہا ہے وہ اپنی معمول کی زندگی میں اس کی نافرمانی سے کتنا ڈرتا ہے؟ وہ اپنے روزمرہ کے معمولات میں اللہ کے احکام وقوانین کا کس قدر پابند ہے؟ کس قدر وہ اپنی توانائیاں، اپنی صلاحیتیں اور اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف کر رہا ہے؟ کیا قربانی کے جانور کا اہتمام اس نے رزقِ حلال سے کیا ہے؟ اس قربانی کے پیچھے اس کا جذبۂ اطاعت وایثار کس قدر کارفرما ہے؟ یہ اور اسی نوعیت کی دوسری شرائط جو قربانی کی اصل روح اور تقویٰ کا تعین کرتی ہیں اگر موجود ہیں تو امید رکھنی چاہیے کہ قربانی اللہ کے حضور قابل قبول ہوگی۔ لیکن اگر یہ سب کچھ نہیں تو ٹھیک ہے آپ نے گوشت کھالیا، کچھ غریبوں کو بھی اس میں سے حصہ مل گیا، اس کے علاوہ شاید قربانی سے اور کچھ فائدہ حاصل نہ ہو۔

﴿كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ﴾ ”اسی طرح اُس نے انہیں تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اللہ کی تکبیر کیا کرو اُس ہدایت پر جو اس نے تمہیں بخشی ہے۔“

مسلمان سال میں دو عیدیں مناتے ہیں۔ ایک عید الفطر ہے جو روزوں کے بعد آتی ہے اور دوسری عید الاضحیٰ جو حج کے ساتھ منسلک ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کے ۲۳ ویں رکوع میں روزوں کے ذکر کے بعد بھی بالکل یہی حکم وارد ہوا ہے: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾﴾ ”تاکہ تم لوگ اللہ کی تکبیر بیان کرو اُس ہدایت پر جس سے اس نے تمہیں سرفراز کیا ہے اور تاکہ تم شکر ادا کیا کرو“۔ یعنی دونوں مواقع پر اللہ کی تکبیر بلند کرتے ہوئے اس کی کبریائی کا اظہار کرنے کی خصوصی ہدایت کی گئی ہے۔ اسی لیے عیدین کی نمازوں کے لیے آتے جاتے تکبیریں پڑھنے کی تاکید احادیث میں ملتی ہے اور عیدین کی نمازوں کے اندر بھی اضافی تکبیریں پڑھی جاتی ہیں۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ”اور (اے نبی ﷺ!) محسنین کو بشارت دے دیجیے۔“

محسنین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اسلام، ایمان اور تقویٰ کی منزلیں طے کرتے ہوئے درجۂ احسان تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ کی توفیق سے اس درجہ کو حاصل کر لیتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین! ثم آمین!

آیات ۳۸ تا ۴۱

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿۳۹﴾ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

اب ہمیں جن آیات کا مطالعہ کرنا ہے ان میں وارد احکام حضور ﷺ کی دعوت وتحریک کی جدوجہد میں ایک نئے موڑ (turning point) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ وہی آیات ہیں جو ہجرت کے سفر کے دوران میں نازل ہوئی تھیں۔ (قبل ازیں آیت ۱۱ کے ضمن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا حوالہ گزر چکا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سورت کی کچھ آیات اثنائے سفر ہجرت میں نازل ہوئی تھیں) — ان آیات کا مضمون اور مقام ومحل اس پہلو سے بھی قابل غور ہے کہ سورۃ البقرۃ کے ۲۳ ویں رکوع میں یعنی تقریباً سورت کے وسط میں رمضان المبارک اور روزے کے احکام وفضائل کا ذکر ہے اور اس کے بعد دو رکوع (۲۴ واں اور ۲۵ واں رکوع) قتال فی سبیل اللہ اور مناسک حج کے احکام پر مشتمل ہیں۔ بالکل اسی طرح یہاں بھی اس سورت کے تقریباً وسط میں دو رکوع مناسک حج پر مشتمل ہیں اور اس کے فوراً بعد اب قتال فی سبیل اللہ کا ذکر آ رہا ہے۔ اس سے اگرچہ سورۃ البقرۃ اور سورۃ الحج کی باہمی مشابہت بھی ظاہر ہوتی ہے لیکن ایک بہت اہم حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں مضامین (حج اور قتال فی سبیل اللہ) میں بہت گہرا ربط ہے۔ اس ربط اور تعلق کی وجہ بظاہر یہ نظر آتی ہے کہ کعبۃ اللہ جو خدائے واحد کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا وہ ان آیات کے نزول کے وقت مشرکین کے زیر تسلط تھا اور توحید کے اس مرکز کو انہوں نے شرک کا اڈّا بنایا ہوا تھا۔ چنانچہ اس وقت امت مسلمہ کا پہلا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ وہ اللہ کے اس گھر کو مشرکین کے تسلّط سے واگزار کرا کے اسے واقعتاً توحید کا مرکز بنائے۔ لیکن یہ کام دعوت اور

وعظ سے ہونے والا تو نہیں تھا' اس کے لیے طاقت کا استعمال ناگزیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں مقامات پر حج بیت اللہ کے احکام کے ساتھ ساتھ قتال فی سبیل اللہ کا تذکرہ ہے۔

آیت ۳۸ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ﴾ ''یقیناً اللہ مدافعت کرے گا اہلِ ایمان کی طرف سے۔''

اس تحریک میں اب جو نیا دور شروع ہونے جا رہا ہے اس میں مسلح تصادم ناگزیر ہے۔ چنانچہ آیت زیر نظر کا اصل پیغام یہ ہے کہ اس رزم گاہ میں اہل ایمان خود کو تنہا نہ سمجھیں۔ ان کی مدد اور نصرت کے لیے اور ان کے دشمنوں کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اللہ ان کی پشت پر موجود ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾﴾ ''اللہ بالکل پسند نہیں کرتا ہر بڑے خیانت کرنے والے' ناشکرے کو۔''

یہ یقیناً مشرکینِ مکّہ کا تذکرہ ہے' جو ایک طرف خیانت کی انتہائی حدود کو پھلانگ گئے تو دوسری طرف ناشکری میں بھی ننگِ انسانیت ٹھہرے۔ یہ لوگ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی وراثت کے امین تھے۔ بیت اللہ گویا ان لوگوں کے پاس ان بزرگوں کی امانت تھی۔ یہ گھر تو تعمیر ہی اللہ کی عبادت کے لیے ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی گواہی ان الفاظ میں دی تھی: ﴿رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (ابراھیم:۳۷) کہ پروردگار! میں اپنی اولاد کو اس گھر کے پہلو میں اس لیے بسانے جا رہا ہوں کہ یہ لوگ تیری عبادت کریں۔ پھر آپؑ نے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے یہ دعا بھی کی تھی: ﴿وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾﴾ (ابراھیم) کہ پروردگار! مجھے اور میری اولاد کو بُت پرستی کی لعنت سے بچائے رکھنا۔ چنانچہ مشرکینِ مکّہ نے اللہ کے اس گھر اور توحید کے اس مرکز کو شرک سے آلودہ کر کے اللہ تعالیٰ ہی کی نافرمانی نہیں کی تھی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی متبرک امانت میں خیانت کا ارتکاب بھی کیا تھا۔

دوسری طرف یہ لوگ اپنے کرتوتوں سے اللہ کی ناشکری کے مرتکب بھی ہوئے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں مکہ کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ بیت اللہ کی وجہ سے ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی میدان میں ان کی اجارہ داری خانہ کعبہ ہی کے طفیل قائم ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ شام (موسم گرما) اور یمن (موسم سرما) کے درمیان ان کے قافلے قبائلی حملوں اور روایتی لوٹ مار سے محفوظ رہتے تھے تو صرف اس لیے کہ وہ بیت اللہ کے متولی تھے۔ یہی وہ حقائق تھے جن کی طرف ان کی

توجہ سورۃ القریش میں دلائی گئی ہے: ﴿لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿۲﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾﴾ ''قریش کو مانوس کرنے کے لیے! انہیں سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے مانوس کرنے کے لیے! پس انہیں چاہیے کہ وہ (اس سب کچھ کے شکر میں) اِس گھر کے رب کی بندگی کریں' جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا' اور خوف میں امن بخشا۔''

مگر اس سب کچھ کے باوجود انہوں نے ناشکری کی انتہا کر دی۔ انہوں نے اللہ کی بندگی کے بجائے بُت پرستی اختیار کی اور بیت اللہ کو توحید کا مرکز بنانے کے بجائے اسے بُت خانے میں تبدیل کر دیا۔ اس پس منظر کو ذہن نشین کر کے آیت زیر نظر کا مطالعہ کیا جائے تو سیاق وسباق بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ خائن اور ناشکرے لوگ کون ہیں جنہیں اللہ پسند نہیں کرتا۔

آیت ۳۹ ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ﴾ ''اب اجازت دی جا رہی ہے (قتال کی) ان لوگوں کو جن پر جنگ مسلّط کی گئی ہے' اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔''

سالہا سال سے انہیں تشدد و تعذیب کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ نت نئے طریقوں سے انہیں ستایا جا رہا تھا۔ انہیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اب تک اللہ تعالیٰ نے ایک حکم کے ذریعے ان کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ یہ حکم اگرچہ وحی جلی کی صورت میں قرآن میں نہیں آیا مگر سورۃ النساء کی آیت ۷۷ میں ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ کے الفاظ میں تصدیق کی گئی ہے کہ انہیں اپنے ہاتھ روکنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وحی خفی کے ذریعے حضور ﷺ کو یہ حکم دیا گیا تھا اور آپ ﷺ نے تمام اہلِ ایمان کو اس سے مطلع فرما دیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے' تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے' تمہیں زندہ بھون کر کباب کر دیا جائے' تم لوگ جواب میں ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے۔ بہر حال اب تک تو یہ حکم تھا' مگر اب ان کے ہاتھ کھولے جا رہے ہیں۔ اب انہیں اجازت دی جا رہی ہے کہ آئندہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ ان کی نصرت پر قادر ہے۔''

تاکیداً یہاں پھر فرما دیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھیں' یقیناً اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے اور وہ ضرور ان کی بھرپور مدد فرمائے گا۔

آیت ۴۰ ﴿الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ ''وہ لوگ جو ناحق اپنے گھروں

سے نکال دیے گئے‘‘

یعنی مہاجرین جنہیں اپنے اہل وعیال اور گھر بار چھوڑ کر مکّہ سے نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

﴿اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ﴾ ’’صرف اس (جرم) پر کہ انہوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے!‘‘

ان کا جرم بس یہ تھا کہ وہ اہلِ مکّہ کے باطل معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کو اپنا رب اور معبود مانتے تھے‘ جس کی پاداش میں انہیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ﴾ ’’اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعے دُور نہ کرتا رہتا‘‘

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۱ میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں پر مشرک بادشاہ جالوت کے ساتھ حضرت طالوت کی جنگ کا ذکر کرنے کے بعد یہ اصول بیان فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً زمین کی صفائی کرتا رہتا ہے۔ فاسد لوگ ہوں یا فاسد تہذیب وثقافت‘ جب ان کا فساد زمین میں ایک حد سے تجاوز کرنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے اسے کسی دوسری طاقت کے ذریعے نیست ونابود کر دیتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں فرمایا گیا کہ اگر اللہ ایسے نہ کرتا تو: ﴿لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ زمین میں ہر طرف فساد ہی فساد ہوتا۔ البتہ یہاں اس بگاڑ یا فساد کے ایک دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

﴿لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ﴾

’’تو ڈھا دیے جاتے ساری خانقاہیں‘ گرجے‘ کنیسے اور مسجدیں‘ جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔‘‘

صَلَوٰتٌ‘ صلوٰۃ کی جمع ہے۔ صَلَوتَا عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس سے مراد یہودیوں کے عبادت خانے (Cinygogs) ہیں۔ دراصل عبرانی اور عربی زبانوں میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یا تو ان کا آپس میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے یا پھر دونوں سگی بہنیں ہیں۔ یعنی یا تو عربی زبان عبرانی سے نکلی ہے اور یا یہ دونوں کسی ایک زبان کی شاخیں ہیں۔ چنانچہ ان دونوں میں بہت سے الفاظ باہم مشابہ ہیں۔ مثلاً عربی کے لفظ ’’سلام‘‘ کی جگہ

عبرانی میں ’’شولوم‘‘ بولا جاتا ہے۔ اسی طرح عبرانی کے ’’یوم کپور‘‘ کو عربی میں ’’یومِ کفارہ‘‘ کہا جاتا ہے۔ یعنی لفظ ’’یوم‘‘ تو جوں کا توں ویسے ہی ہے جبکہ ’’کپور‘‘ اور ’’کفارہ‘‘ میں بنیادی فرق ’’پ‘‘ اور ’’ف‘‘ کا ہے۔ عربی میں چونکہ ’’پ‘‘ نہیں ہے اس لیے اکثر زبانوں کی ’’پ‘‘ کی آواز عربی میں آ کر ’’ف‘‘ سے بدل جاتی ہے۔ جیسے اس سے پہلے سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۵ کے تحت ’’ذوالکِفل‘‘ کے حوالے سے ہندی کے لفظ ’’کپل‘‘ کا عربی کے ’’کِفل‘‘ کی صورت اختیار کرنے کا ذکر ہوا تھا۔ بہرحال عبرانی اور عربی زبانوں کے الفاظ اور ان کی اصطلاحات میں اکثر مشابہت پائی جاتی ہے۔

تو اگر اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق کچھ لوگوں کو کچھ لوگوں کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا‘ یعنی مفسد قوتوں کو نیست ونابود نہ کرتا رہتا تو دنیا میں تمام مذاہب کی جتنی بھی عبادت گاہیں ہیں وہ سب کی سب منہدم کر دی جاتیں۔ ظاہر ہے یہ تمام عبادت گاہیں اپنے اپنے وقت میں ایک اللہ کی عبادت کے لیے بنائی گئی تھیں۔

﴿وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ﴾ ’’اور اللہ لازماً اُس کی مدد کرے گا جو اُس کی مدد کرے گا۔‘‘

ان الفاظ میں اہل ایمان کے لیے یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔ لہٰذا آیت کا یہ ٹکڑا ہر مسلمان کو ازبر ہونا چاہیے۔ اس عبارت میں تاکید کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ عربی زبان میں انتہائی تاکید کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ فعل مضارع سے پہلے لام مفتوح (زبر کے ساتھ) بھی حرفِ تاکید ہے‘ جبکہ آخر میں نون مشدّد سے معنی میں مزید تاکید پیدا ہوتی ہے۔ جیسے اَفْعَلُ کے معنی ہیں کہ میں یہ کروں گا‘ لیکن لَاَفْعَلَنَّ کے معنی ہوں گے کہ میں یہ لازماً کر کے رہوں گا۔

لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ یک طرفہ معاملہ نہیں ہے‘ بلکہ یہ وعدہ مشروط ہے۔ تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا! جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۲ میں فرمایا گیا ہے: ﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ﴾ کہ تم مجھے یاد رکھو‘ میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ تم لوگ اللہ کے باغیوں کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھاؤ‘ تمہاری وفاداریاں اللہ کے دشمنوں کے ساتھ ہوں اور پھر بھی تم چاہو کہ وہ تمہاری مدد کرے۔ اس سلسلے میں اسی سورت کی آیت ۱۵ کا مضمون بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے‘ جس میں اللہ کی مدد پر بندۂ مؤمن کے پختہ یقین کا معاملہ زیر بحث آیا ہے۔ دراصل یہ بندۂ مؤمن کا ’’یقین‘‘ ہی ہے جو اس کے صبر واستقامت

اور ثبات و استقلال کے لیے سہارا فراہم کرتا ہے۔ اور اگر دل میں یقین کی جگہ بے یقینی ڈیرے جما لے اور اس بے یقینی کے ہاتھوں نصرتِ الٰہی کی اُمید کی رسّی ہی کٹ جائے تو پھر ایسے شخص کے لیے دنیا میں اور کوئی سہارا نہیں رہتا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝۴۰﴾ ''یقیناً اللہ طاقتور ہے' زبردست ہے۔''

یعنی اللہ نے تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے تو جان لو کہ وہ زبردست طاقت کا مالک اور ہر وقت' ہر جگہ تمہاری مدد پر پوری طرح قادر ہے۔

آیت ۴۱ ﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ﴾ ''وہ لوگ کہ اگر انہیں ہم زمین میں تمکّن عطا کر دیں تو''

''تمکّن'' کا ذکر اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے سورۂ یوسفؑ کی آیت ۲۱ اور ۵۶ میں بھی آ چکا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ﴾ ''اور اسی طرح ہم نے یوسفؑ کو زمین میں تمکّن عطا کیا''۔ تو اپنے ان مؤمن بندوں کو اگر ہم کسی خطۂ زمین کا اختیار و اقتدار عطا کریں گے تو ان کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟

﴿اَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ ''وہ نماز قائم کریں گے''

مؤمنین کو اگر کسی ملک پر حکومت کرنے کا اختیار ملے گا تو وہ اپنی پہلی ترجیح کے طور پر نماز کا نظام قائم کریں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچتے ہی جمعہ کے قیام کا اہتمام فرمایا اور اقامتِ صلوٰۃ کے لیے ترجیحی بنیادوں پر مسجدِ نبوی کی تعمیر کی۔

﴿وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ ''اور زکوٰۃ ادا کریں گے''

پھر زکوٰۃ کا باقاعدہ نظام قائم کیا جائے گا تاکہ معاشرے کے پس ماندہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی کفالت کا بندوبست ہو سکے۔

﴿وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ''اور وہ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔''

﴿وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱﴾ ''اور تمام امور کا انجام تو اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔''

اگر یہ روایت صحیح ہے کہ یہ آیات سفرِ ہجرت کے دوران میں نازل ہوئی تھیں تو ان میں سے خصوصی طور پر یہ آیت حضور ﷺ کے مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد کی صورت حال کے

لیے ایک منشور (manifesto) کا درجہ رکھتی ہے۔ چونکہ عنقریب مدینہ میں آپ ﷺ کا ورود ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہونے والا تھا اور مدینہ پہنچتے ہی آپ ﷺ کو اختیار و اقتدار ملنے والا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے پیشگی بتا دیا کہ اس صورت حال میں آپ ﷺ کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ چنانچہ جس طرح آج کل ہر سیاسی پارٹی الیکشن سے پہلے اپنا منشور جاری کرتی ہے کہ حکومت ملنے کی صورت میں ہماری ترجیحات کیا ہوں گی' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہلِ ایمان کو ہمیشہ کے لیے ایک منشور عطا کر دیا ہے کہ کسی ملک میں اقتدار ملنے کی صورت میں انہیں کون کون سے امور ترجیحی بنیادوں پر انجام دینے ہوں گے۔

یہ وہ خاص آیات (۳۸ تا ۴۱) ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگ اس سورت کو مدنی سورت سمجھتے ہیں' البتہ درست موقف یہی ہے کہ یہ آیات یا تو اثنائے سفرِ ہجرت میں نازل ہوئیں یا نبی اکرم ﷺ کے مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد۔ لیکن انہیں مضامین حج کی مناسبت سے اس مکی سورت میں اس مقام پر رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد اگلی آیت سے دوبارہ مکی انداز کے مضامین کا آغاز ہو رہا ہے۔

آیات ۴۲ تا ۴۸

وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۝۴۲ وَقَوْمُ اِبْرٰهِیْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۝۴۳ وَّاَصْحٰبُ مَدْیَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰی فَاَمْلَیْتُ لِلْكٰفِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ۝۴۴ فَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِیَ ظَالِمَةٌ فَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِیْدٍ ۝۴۵ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ۝۴۶ وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۴۷ وَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَمْلَیْتُ لَهَا وَهِیَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَیَّ الْمَصِیْرُ ۝۴۸

آیت ۴۲ ﴿وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۝۴۲﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو ان سے پہلے قومِ نوحؑ' قومِ عاد اور قومِ ثمود کے لوگ بھی (رسولوںؑ کو) جھٹلا چکے ہیں۔''

آیت ۴۳ ﴿وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۝۴۳﴾ ''اور ابراہیمؑ کی قوم اور لوطؑ کی قوم بھی (رسولوںؑ کی تکذیب کر چکی ہے)۔''

آیت ۴۴ ﴿وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى﴾ ''اور مدین کے لوگ بھی (اپنے پیغمبر کو جھٹلا چکے ہیں) اور موسیٰؑ کی بھی تکذیب ہو چکی ہے''

﴿فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝۴۴﴾ ''تو میں نے ان کافروں کو کچھ ڈھیل دی' پھر میں نے ان کو پکڑ لیا' تو کیسی رہی میری پکڑ؟''

ان اقوام کے انجام سے متعلق تفصیلات قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہیں۔

آیت ۴۵ ﴿فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ﴾ ''اور کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا اور وہ ظالم تھیں''

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے جس جس بستی کو ہلاک کیا ان کے باسی مجرم اور گناہگار تھے۔ جب بھی کوئی بستی کفر و شرک اور دوسرے گناہوں کے سبب معصیت اور برائی کا مرکز بن جاتی تو اس کا وجود معاشرے کے لیے خطرے کی علامت بن جاتا۔ چنانچہ جس طرح انسانی جسم کا کوئی حصہ گل سڑ کر متعفّن مواد سے بھر جائے تو باقی جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے اس حصے یا عضو کو کاٹ پھینکنا ناگزیر ہو جاتا ہے' بالکل اسی طرح اللہ کی مشیت سے ہر ایسی بستی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

﴿فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ ''تو وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر''

﴿وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ﴾ ''اور کتنے ہی ناکارہ کنویں (بند پڑے ہیں)''

ان تباہ ہونے والی بستیوں میں کتنے کنویں ہوں گے جو کسی وقت بڑی محنت سے کھودے گئے ہوں گے۔ اپنے اپنے وقت پر ان کنووں پر پانی بھرنے والے لوگوں کے کیسے کیسے جمگھٹے رہا کرتے ہوں گے' مگر اب وہ کنویں ویران و معطل پڑے ہیں۔

﴿وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝۴۵﴾ ''اور کتنے ہی مضبوط بنائے ہوئے محل (بھی ویران پڑے ہیں)۔''

ان قوموں کے گچ کاری کیے گئے مضبوط اور عالی شان محل اب کھنڈرات میں تبدیل ہوئے پڑے ہیں۔ سپین میں جا کر الحمرا کو دیکھو! کبھی یہ محل مسلمان فرمانرواؤں کا مسکن تھا' آج اس کی کیا کیفیت ہے؟ قرطبہ کی عالی شان مسجد کو دیکھو! جہاں اب نہ کوئی سجدہ کرنے والا ہے

اور نہ وہاں کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت ہے۔

[بئرٍ اور قَصْرٍ ، قَرْيَةٍ پر عطف ہیں۔]

آیت ۴۶ ﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ﴾ ''تو کیا یہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں ہیں کہ ہوتے ان کے دل جن سے یہ سمجھتے!''

اگر یہ لوگ عقل اور سمجھ سے کام لیتے تو پیغمبروں کو جھٹلانے والی قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھ کر عبرت پکڑتے اور اصل بات کی تہہ تک پہنچتے۔ اس آیت میں ایک بہت اہم نکتہ بیان ہوا ہے کہ یہاں لفظ ''قلب'' کے ساتھ عقل اور سمجھنے کے تعلق کی بات ہوئی ہے۔ یہ بات کئی دفعہ اس سے پہلے بھی میں دہرا چکا ہوں کہ انسان ایک مرکب وجود کا حامل ہے۔ اس مرکب کی ایک اکائی تو اس کا جسم ہے جو خالص ایک حیوانی وجود ہے۔ اس وجود میں حیوانوں کی تمام تر خصوصیات (faculties) موجود ہیں۔ اس لحاظ سے انسان گویا اعلیٰ ترین حیوان ہے' یعنی اپنے جسم کی ساخت کے اعتبار سے وہ تمام حیوانوں سے افضل ہے۔ لیکن اپنے اس حیوانی وجود کے ساتھ ساتھ انسان اپنا ایک روحانی وجود بھی رکھتا ہے' جو اس کے حیوانی وجود سے علیحدہ اور مستقل بالذّات وجود ہے۔ انسان کے ان دونوں وجودوں کے ملاپ اور امتزاج کی ترکیب اور کیفیت کے متعلق ہم کچھ بھی ادراک نہیں رکھتے۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ انسانی وجود کے اندر جو ''جان'' (life) ہے وہ کہاں ہے؟ کیا یہ جان دل میں ہے؟ لیکن دل تو آج کل بدل بھی دیا جاتا ہے اور جان وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ تو کیا یہ جان دل سے متعلق ہے یا دماغ سے متعلق؟ حقیقت بہر حال یہی ہے کہ اس کے متعلق ہم واقعی نہیں جانتے۔ تو جب ہم جان کے متعلق ہی کچھ نہیں جانتے تو اس سے آگے بڑھ کر ''روح'' کے متعلق ہم کیا جان سکتے ہیں کہ انسان کی روح اس کے جسم کے اندر کس طور سے صحبت پذیر ہے؟ ؎

اتّصالے بے تکیّف بے قیاس!
ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس

انسان کے حیوانی اور روحانی وجود میں باہم مصاحبت اور اتصال تو ہے' لیکن اس کی نوعیت واقعتاً کیا ہے؟ بقول شاعر یہ مصاحبت اور اتصال ''بے تکیف و بے قیاس'' ہے۔ نہ اس کی کیفیت معلوم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اسے کسی اور چیز پر قیاس کیا جا سکتا ہے' لیکن انسان کے دو علیحدہ علیحدہ وجود بہر حال موجود ہیں۔ ان میں سے اس کا روحانی وجود بہت پہلے عالم ارواح

میں پیدا کیا گیا تھا‘ جس کا حوالہ سورۃ الانعام کی آیت ۹۴ میں اس طرح آیا ہے: ﴿کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ﴾ جبکہ ہر انسان کے مادی یا جسمانی وجود کی پیدائش اس دنیا یا عالم خلق کے اندر اپنے اپنے وقت پر ہوتی ہے۔

اس ساری تفصیل میں سیاق وسباق کے حوالے سے سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ انسان کے دونوں وجودوں میں سے ہر وجود کی اپنی اپنی صلاحیتیں اور اپنے اپنے ذرائع علم ہیں۔ روح کی اپنی عقل‘ اپنی بصارت اور اپنی سماعت ہے‘ جبکہ حیوانی وجود کی اپنی عقل ہے‘ اپنی آنکھیں اور اپنے کان ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت میں حیوانی وجود ہی کے حواس کا ذکر ہے: ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾﴾۔ سورۂ بنی اسرائیل کے مطالعے کے دوران اس آیت کے تحت حیوانی وجود کے ذرائع علم سے متعلق تفصیلاً گفتگو ہو چکی ہے۔ اب آیت زیر نظر میں روحانی وجود کے ذرائع علم کی بات ہو رہی ہے۔ اس کو مختصراً یوں سمجھ لیں کہ روح دیکھتی بھی ہے‘ سنتی بھی ہے اور سمجھتی بھی ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے یہاں فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کے دل ہوتے جن سے یہ بات سمجھتے!

﴿اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِہَا ۚ﴾ ’’یا (ہوتے ان کے) کان جن سے یہ سنتے!‘‘

﴿فَاِنَّہَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾﴾ ’’تو اصل میں آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں‘ بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔‘‘

ذرا غور کریں‘ یہ کون سا اندھا پن ہے؟ دراصل یہی وہ اندھا پن تھا جو ابوجہل‘ ابولہب اور ولید بن مغیرہ جیسے لوگوں کو لاحق تھا۔ ان کی آنکھیں تو اندھی نہیں تھیں‘ لیکن ان کے دل مکمل طور پر اندھے ہو چکے تھے۔ ان کی روحوں پر دُنیوی اغراض‘ ہٹ دھرمیوں اور عصبیتوں کے غلیظ پردے پڑ چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی روحیں نہ دیکھ سکتی تھیں‘ نہ سن سکتی تھیں اور نہ سمجھ سکتی تھیں۔ ایسے لوگوں کا دیکھنا اور سننا صرف حیوانی سطح کا دیکھنا اور سننا ہوتا ہے۔ جیسے تیزی سے گزرتی ہوئی کار کو دیکھ کر انسان بھی ایک طرف ہو جاتا ہے اور کُتّا بھی اس سے اپنا بچاؤ کر لیتا ہے۔ اس حوالے سے انسان اور کُتّے کے دیکھنے میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ انسان کو چاہیے کہ اپنی ان صلاحیتوں کے اعتبار سے حیوانوں کی سطح سے ترقی کر کے انسانی مقام و مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسی نکتہ کو اقبال جیسے صاحبِ نظر نے یوں بیان کیا ہے: ’’دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!‘‘ کہ ذرا دوسری طرح کا دیکھنا سیکھو اور دوسرے انداز کا سننا سیکھو!

قریشِ مکّہ کے تجارتی قافلے عذابِ الٰہی کی زد میں آنے والی تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات کے پاس سے گزرا کرتے تھے۔ وہ لوگ ان کھنڈرات کو دیکھتے تو تھے لیکن وہ یہ سب کچھ حیوانی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ نہ وہ ان سے کوئی سبق حاصل کرتے تھے‘ نہ عبرت پکڑتے تھے۔ انسان کی یہی وہ کیفیت ہے جس کے بارے میں آیت زیر مطالعہ میں فرمایا گیا ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔ اس لیے کہ روح کا مسکن قلب ہے۔ ہم یہ تو نہیں سمجھ سکتے کہ اس ملاپ کی نوعیت اور کیفیت کیا ہے اور نہ ہی ہم دل کے اندر کسی طریقے سے روح کے اثرات کا کھوج لگا سکتے ہیں‘ کیونکہ وہ ایک غیر مرئی چیز ہے‘ لیکن انسان کے حیوانی وجود کے اندر روح کا تعلق بہر حال اس کے ’’قلب‘‘ کے ساتھ ہی ہے۔

آیت ۴۷ ﴿وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ ؕ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ عذاب کے بارے میں آپ سے جلدی مچا رہے ہیں‘ اور اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا۔‘‘

عذاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سب وعدے ہر صورت میں پورے ہوں گے اور ان لوگوں پر عذاب آ کر رہے گا۔ البتہ یہ عذاب کب آئے گا؟ کس شکل میں آئے گا؟ اس کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اس نے ایسی تمام معلومات خفیہ رکھی ہیں۔ سورۃ الانبیاء میں اس موضوع سے متعلق حضور ﷺ سے یوں اعلان کرایا گیا: ﴿وَاِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾﴾ ’’اور میں نہیں جانتا کہ جس عذاب کا تم لوگوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہے یا کچھ عرصے بعد آئے گا۔‘‘

﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ’’اور یقیناً ایک دن آپؐ کے رب کے نزدیک ایک ہزار برس کی طرح ہے اُس حساب سے جو گنتی تم کرتے ہو۔‘‘

دنیا میں عام انسانی حساب کے مطابق ایک ہزار برس کا عرصہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن کے برابر ہے۔ سورۃ السجدۃ میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۵﴾﴾ ’’اللہ آسمان سے زمین تک کے ہر معاملے کی تدبیر کرتا ہے‘ پھر یہ چڑھتا ہے اس کی طرف ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ہے ایک ہزار سال‘ جیسے تم لوگ گنتے ہو‘‘۔

یہ ''تدبیرِ اَمر'' دراصل اللہ تعالیٰ کے ان تین کاموں میں سے ایک ہے جن کے متعلق قبل ازیں سورۂ یونس کی آیت ۳ کے تحت (جلد چہارم) شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے حوالے سے بتایا جا چکا ہے' یعنی ابداع' خلق اور تدبیر۔ چنانچہ اس تیسرے کام (تدبیر) کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو طرح طرح کے احکام دیے جاتے ہیں اور پھر فرشتوں کے ذریعے سے ہی ان احکام کی تنفیذ (execution) ہوتی ہے۔ اس منصوبہ بندی میں اللہ کے ہاں ایک دن کا عرصہ انسانی گنتی کے مطابق ایک ہزار برس کے برابر ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ مضمون چونکہ بہت واضح الفاظ کے ساتھ قرآن میں دو مرتبہ آیا ہے اس لیے یہ معاملہ ''متشابہات'' میں سے نہیں بلکہ ''محکمات'' کے درجے میں ہے۔

آیت ۴۸ ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ﴾ ''اور کتنی ہی بستیاں ایسی تھیں کہ میں نے انہیں ڈھیل دی تھی لیکن وہ گناہگار تھیں''

﴿ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝۴۸﴾ ''پھر میں نے ان کو پکڑ لیا' اور (سب نے) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔'' ❁❁❁

- قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ؟
- قرآن وسنت کی روشنی میں قربانی کا فلسفہ کیا ہے؟
- عیدالاضحیٰ اور قربانی میں باہم چولی دامن کا ساتھ کیوں ہے؟
- حج کے موقع پر منیٰ میں کی جانے والی قربانی اور اس موقع پر پوری دنیا میں کی جانے والی قربانی میں کیا ربط وتعلق ہے؟

ان سوالات کی وضاحت کے لیے مطالعہ کیجیے:

عیدالاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی

اور

حج اور عیدالاضحیٰ اور اُن کی اصل روح

قرآن حکیم کے آئینے میں

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی ایک تقریر اور ایک تحریر پر مشتمل مختصر مگر جامع کتابچہ

قیمت اشاعت خاص: 45 روپے' اشاعتِ عام: 30 روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

مکتبہ خدام القرآن لاہور 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور فون 03-35869501

maktaba@tanzeem.org

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اور اس کی اہمیت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۲۰ جون ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾﴾ (لقمٰن)

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰہُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾ (الحج)

﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ؕ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

﴿وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

﴿لَوْلَا یَنْہٰہُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِہِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِہِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ (المائدۃ)

﴿کَانُوْا لَا یَتَنَاہَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ ؕ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾ (المائدۃ)

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُکِّرُوْا بِہٖٓ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْہَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِیْسٍۢ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾﴾ (الاعراف)

﴿فَلَوْلَا کَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِکُمْ اُولُوْا بَقِیَّۃٍ یَّنْہَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِی

الْاَرْضِ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْہُمْ ۚ﴾ (ہود: ۱۱۶)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (۱)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ (طاقت) سے بدلے اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے (منع کرے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے (برا جانے)' اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

معزز سامعین کرام!

امام یحییٰ بن شرف الدین النووی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور مجموعہ احادیث ''اربعین نووی'' کا سلسلہ وار مطالعہ جاری ہے اور اس ضمن میں آج حدیث ۳۴ ہمارے زیر مطالعہ آئے گی۔ یہ حدیث امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے ہے اور معاشرے کے اندر اچھائی کو برقرار رکھنے اور برائی کو دبانے کے لیے قرآن مجید کا میکنزم واضح کرتی ہے۔ ایک تو جرم کا معاملہ ہے' لیکن بہت سی برائیاں ایسی ہوتی ہیں جو قابلِ دست اندازیٔ پولیس نہیں ہوتیں۔ فرض کیجیے' ایک شخص نماز نہیں پڑھتا تو پولیس اسے نماز پڑھنے پر مجبور نہیں کر سکتی' البتہ معاشرے کے اندر ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو ایسے شخص کو نماز کی تلقین کرتے رہیں اور نہ پڑھنے پر ملامت کرتے رہیں۔ مزید یہ کہ اگر آپ کے پاس کوئی اختیار ہے تو آپ اسے سزا بھی دیجیے' مثلاً آپ کا اپنا بچہ دس سال سے زائد کا ہو گیا ہے لیکن وہ نماز میں سستی کرتا ہے تو آپ اسے مار سکتے ہیں اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ دس سال کی عمر کے بعد بھی اگر بچہ نماز نہ پڑھے تو باپ کو اجازت ہے کہ وہ اسے مار کر نماز کا پابند بنائے۔

آج مغربی معاشروں میں تو اس کا تصور بھی نہیں ہے۔ بڑے بچے تو درکنار آپ اپنے چھوٹے سے چھوٹے بچے کو بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو وہ فوراً

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان..... وسنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ماجاء فی تغییر المنکر بالید او باللسان او بالقلب۔

کال کر کے پولیس کو بلالے گا اور پھر پولیس آپ کو لے جائے گی اور آپ کے بچے کو بھی۔ پھر بچہ مستقل طور پر آپ سے لے لیا جا سکتا ہے کہ آپ اس قابل نہیں ہیں کہ بچے کی پرورش کر سکیں‘ اس لیے کہ آپ نے بچے کو مارا ہے اور بچوں کی مار پٹائی ان کے ہاں بہت بڑا جرم ہے۔ خدانخواستہ کسی کی بیٹی آوارہ ہوگئی ہے تو وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کوئی سزا دینا تو دور کی بات ہے‘ اسے دھمکا بھی نہیں سکتے۔ لیکن اسلام میں یہ تصور ہے کہ آپ خاندان کے سربراہ ہیں اور آپ اپنی اولاد کو جسمانی سزا دے سکتے ہیں۔

اگر آپ کے پاس حکومتی سطح پر اختیار ہے تو پھر آپ کا فرض ہے کہ اجتماعی سطح پر ایک ایسا ادارہ بنائیں جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے۔ اسلامی ریاست کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے۔ ہم نے یہ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سعودی عرب کے اندر نماز کا وقت ہوا اور اذان ہوتے ہی سارے بازار بند ہوگئے۔ وہاں ان کا ایک علیحدہ محکمہ ہے: **الھیئۃ للامر بالمعروف والنھی عن المنکر**‘ جس کا کام ہی لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا ہے۔ وہاں کے ’’شُرطے‘‘ مشہور ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ وہ کسی سے کچھ کہتے نہیں تھے‘ بس اپنی لاٹھی ٹھک ٹھک کرتے ہوئے آتے تھے اور جیسے جیسے ٹھک ٹھک کی آواز آتی تھی تو سب لوگ دکانیں بند کر کے نماز کے لیے جا رہے ہوتے تھے۔ یہ میں ۱۹۶۲ء کی بات کر رہا ہوں جب مجھے پہلی مرتبہ حج کی سعادت حاصل ہوئی تھی کہ وہاں منیٰ ایکسچینجرز کے ٹیبل عین سڑک کے کنارے لگے ہوتے تھے‘ جن پر ڈالر‘ پاؤنڈ‘ ریال اور دیگر کرنسی نوٹ بڑی تعداد میں پڑے ہوتے تھے‘ اور جیسے ہی اذان ہوتی تو وہ لوگ ان کے اوپر صرف چادر ڈال کر مسجد کی طرف چل پڑتے۔ ان کو کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ چوری ہو جائے گی۔ میں نے گزشتہ جمعہ یہ بات عرض کی تھی کہ یہاں بھی چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا اگر نافذ ہو جائے تو پھر یہ فضا پیدا ہو جائے گی۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر‘ احادیث کی روشنی میں

زیر مطالعہ حدیث مسلم شریف کی ہے اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے خود سنا: ((مَنْ رَاٰی

مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ)) ’’جو شخص بھی تم میں سے کسی منکر (بدی) کو دیکھے‘ اس کا فرض ہے کہ اسے اپنی طاقت سے بدل دے‘‘۔ غور کیجیے یہ فرض ہے۔ یہ نہیں کہ انسان سوچے کہ جو کوئی برائی کرتا ہے کرتا رہے‘ خود عذاب سہے گا۔ ہرگز نہیں! اسے برائی سے روکنا آپ پر فرض ہے اور اگر آپ نہیں روک رہے تو آپ گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ چنانچہ جہاں آپ کا اختیار ہو وہاں اپنے زورِ بازو سے برائی کو روکیں۔ حکومتی سطح پر تو طاقت موجود ہوتی ہے‘ چنانچہ حکومت وقت اپنے اہلکاروں کے ذریعے برائی کو بزور روک سکتی ہے اور اچھائی کا نفاذ کرا سکتی ہے۔ لیکن اگر طاقت نہیں ہے تو: ((فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ)) ’’پھر اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے بدل دے‘‘۔ یعنی اپنی زبان سے برائی کو روکے۔ غلط کام کرنے والے سے برملا کہے کہ خدا کے بندے‘ یہ غلط کام مت کرو‘ یہ حرام کام ہے‘ اس سے باز آجاؤ۔ اور اگر زبان سے روکنے کی بھی طاقت نہیں ہے‘ یعنی معاشرے میں زبانوں کے اوپر بھی اس طریقے سے تالے ڈال دیے جائیں کہ بولنا بھی گویا جرم شمار ہو رہا ہو اور آواز اُٹھانے پر زبان کھینچ دی جاتی ہو تو اس صورت میں یہ ہے کہ: ((فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ)) ’’پھر اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کم سے کم اپنے دل میں (اس کے خلاف) ایک نفرت کا معاملہ رکھے‘‘۔ ((وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) ’’اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے‘‘۔ اگر دل میں بھی گناہ اور بدی سے نفرت کا معاملہ نہ ہو تو پھر ایمان کی مطلق نفی ہے۔

اس حدیث کی ہم مضمون ایک اور روایت ہے جو ذرا مفصل انداز میں ہے‘ وہ بھی آپ سن لیجیے۔ اسے بھی امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّۃٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ)) ’’اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کوئی نبی کسی اُمت میں نہیں بھیجا مگر اس کے لیے اس کی امت میں سے کچھ نہ کچھ حواری اور اصحاب ہوتے تھے‘‘۔ وہ خصوصی طور پر دو کام کرتے تھے‘ پہلا کام یہ تھا کہ: ((یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ)) ’’وہ اس کی سنت کو مضبوطی سے تھامتے تھے‘‘ اور دوسرا کام یہ

تھا کہ ((وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ)) ''اور وہ اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے''۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور نئی نسل کے آجانے سے جذبہ ٹھنڈا پڑنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر ناخلف اور نافرمان لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اس بات کو بایں الفاظ فرمایا: ((ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ)) ''پھر ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ ان نبیوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوتے رہے''۔ ان کے دو کام یہ تھے کہ: ((یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ)) ''جو کہتے تھے وہ کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں ہوا تھا''۔ آگے فرمایا: ((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِیَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''تو جو شخص ان (ناخلف لوگوں) کے خلاف اپنی طاقت سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے'' ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو کوئی ان کے خلاف اپنی زبان سے جہاد کرے وہ بھی مؤمن ہے'' ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور جو ان کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے (یعنی نفرت رکھے) وہ بھی مؤمن ہے''۔ ((وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))(۱) ''اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔''

امر بالمعروف ونہی عن المنکر' ایک جامع اصطلاح

امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے متعلق یہ بات بہت اہم ہے کہ یہ قرآن حکیم کی ایک جامع اصطلاح ہے اور یہ قرآن میں ایک وحدت کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے دس مقامات پر یہ دونوں ایک جامع اور مربوط اصطلاح کی شکل میں آئے ہیں اور ان میں سے چند آیات میں نے ابتدا میں آپ کو سنائی ہیں۔ سورۂ لقمان میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو کی گئی نصیحتوں کا تذکرہ ہے' جس میں سے ایک نصیحت یہ ہے:

﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾﴾ (لقمٰن)

''اے میرے بچے! نماز قائم رکھ' نیکی کا حکم دے اور بدی سے روک' اور پھر جو کچھ تجھ پر بیتے اسے برداشت کر۔ یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان.....

ظاہر بات ہے کہ بدی سے روکنے پر اشرار' بدمعاش اور بدقماش لوگ اس کی شدید مخالفت کریں گے۔ اب یہ مخالفت زبانی کلامی (verbel) بھی ہو سکتی ہے اور بالفعل اقدام کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے' لہٰذا اس مخالفت کو برداشت کرو اور اس پر صبر کرو۔

سورۃ الحج میں یہ آیت آئی ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾ (آیت ۴۱)

''وہ لوگ جنہیں ہم زمین میں اقتدار عطا کر دیں تو وہ (۱) نماز کا نظام قائم کریں گے اور (۲) زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور (۳) بدی سے روکیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے۔''

سورۂ لقمان کی آیت گویا حکمت اور فطرت کا تقاضا ہے' اس لیے کہ حضرت لقمان نہ نبی تھے اور نہ کسی نبی کے پیروکار تھے۔ وہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان تھے اور وہ جن نتائج تک پہنچے ہیں وہ گویا انسانی فطرت اور حکمت کا تقاضا ہے' اس لیے وہاں یہ اصطلاح واحد کے صیغے میں آئی ہے' جبکہ اس کی ایک بلند ترین سطح یہ ہو سکتی ہے کہ جو لوگ یہ کام کرنے والے ہیں' اگر اللہ ان کو زمین میں اقتدار عطا فرما دے تو وہ حکومتی سطح پر بھی انہی کاموں کو جاری رکھیں گے۔ اس کا ذکر سورۃ الحج کی مذکورہ آیت میں ہوا ہے۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرآن مجید کے دس مقامات پر ایک اصطلاح کے طور پر لازم وملزوم کی حیثیت سے آئے ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار احادیث بھی ایسی ہیں جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک جامع اصطلاح کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔ اس کے راوی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں' وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَیُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا یُسْتَجَابُ لَكُمْ))(۱)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' (اے مسلمانو!) تم

(۱) سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ماجاء فی الامر بالمعروف ونهی عن المنکر۔

لازماً نیکی کا حکم دو گے اور بدی سے روکو گے‘ ورنہ اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر ایسا عذاب بھیجے گا کہ پھر تم دعائیں مانگو گے لیکن اللہ تمہاری دعا قبول نہیں کرے گا۔‘‘

امر بالمعروف ونہی عن المنکر‘ اُمت کا فرضِ منصبی

ابتدا میں‘ میں نے جن آیات کی تلاوت کی ان میں دو آیات سورۂ آل عمران کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو نیکی کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا‘ یہ اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

’’تم بہترین اُمت ہو جو نوعِ انسانی کے لیے نکالی گئی ہے (اور تمہارا کام یہ ہے کہ) تم نیکی کا حکم دو‘ بدی سے روکو‘ اور اللہ پر اپنے یقین کو پختہ رکھو۔‘‘

جو انسان بھی امر بالمعروف اور خاص طور پر نہی عن المنکر کا علم لے کر کھڑا ہوتا ہے تو اسے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غیر تو پھر غیر ہیں‘ اپنے ہی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین بہت ضروری ہے‘ اس لیے کہ اسی یقین ہی کی بدولت انسان کے اندر وہ قوت پیدا ہو گی جس سے وہ مخالفت کو برداشت کر سکے گا‘ تشدد کو جھیل سکے گا اور زیادتی کو سہہ سکے گا۔

سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیت میں تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو امتِ مسلمہ کا اجتماعی فرض قرار دیا گیا ہے‘ جبکہ آیت ۱۰۴ میں اسی حوالے سے ایک اور شکل بھی بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ فرض کیجیے‘ اُمت اپنے اس فرضِ منصبی کو بھول گئی ہو —— ویسے تو یہ پوری اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے اور اسے پوری نوعِ انسانی کے اوپر اسی لیے اٹھایا گیا ہے کہ وہ پوری نوعِ انسانی کو نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔ گویا اس امت کو خدائی فوجدار کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ اُمت اس فرضِ منصبی کو بھول گئی ہے اور غفلت کی نیند سو گئی ہے تو ایسی صورتِ حال میں پھر یہ ضرور ہونا چاہیے کہ کچھ لوگ تو ایسے ہوں جو بیدار ہوں اور سوئی ہوئی امت کو جگانے کا کام کریں۔ جیسے حکیم محمد سعید مرحوم کے ادارے نے ایک سلوگن اختیار کیا تھا: ’’جاگو اور جگاؤ!‘‘ یہ بڑا اچھا

سلوگن ہے کہ اس امت میں سے جو جاگ گئے ہیں یا جاگے ہوئے ہیں وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں‘ بلکہ دوسروں کو جگائیں۔ پھر جاگے ہوئے مل کر ایک امت بن جائیں۔ یعنی ایک اُمت تو سوئی ہوئی ہے —— ہے تو وہ بھی اُمت‘ اس لیے کہ نام لیوا تو محمد ﷺ کے ہیں —— پھر اس سوئی ہوئی اُمت میں سے کچھ لوگ لازماً جاگیں اور مل جل کر ایک امت بن کر باقی سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے کا کام اجتماعی طور پر کریں۔ اس کو انگریزی میں party within party یعنی ایک جماعت کے اندر ایک جماعت کہا جاتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۴ میں اسی کا ذکر ہے کہ ویسے تو یہ ساری اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی ہے کہ اس نے دعوت وتبلیغ‘ شہادت علی الناس اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کرنا ہے‘ لیکن اگر اُمت مسلمہ اپنا یہ فرض بھول جائے تو پھر کم از کم کچھ لوگوں کو ضرور یہ کام کرنا چاہیے۔ فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴﴾ (آل عمران)

’’تم سے ایک ایسی امت میں وجود میں آنی چاہیے (یا تمہارے اندر سے کم سے کم ایسی ایک امت تو قائم رہنی چاہیے) جو نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے اور خیر کی طرف دعوت دے۔ اور وہی لوگ ہوں گے جو (اللہ تعالیٰ کے ہاں) کامیاب ہونے والے ہیں۔‘‘

فلاح اور کامیابی کا وعدہ سوئی ہوئی امت سے نہیں ہے‘ ہاں ان سوئے ہوؤں میں سے جو جاگ جائیں اور اپنے فرضِ منصبی کو پہچانیں اور پھر اس کے لیے تن من دھن لگائیں‘ وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

اب تک میں نے آپ کے سامنے یہ بات رکھی کہ بحیثیت مجموعی یہ دونوں گویا ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دو پہیوں پر گاڑی چلتی ہے‘ ورنہ ایک پر تو گھومتی ہی رہے گی‘ آگے نہیں بڑھے گی۔ اس حوالے سے یہ بھی یاد رکھیے کہ ان دونوں میں سے نہی عن المنکر کی اہمیت زیادہ ہے۔ ہمارے ہاں ایک بہت بڑے طبقہ کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ نہی عن

المنکر کی ضرورت نہیں ہے۔ بس نیکی کا حکم دیتے رہو‘ جب نیکی پھیلے گی تو منکر خود بخود مٹ جائے گا‘ جیسے روشنی آتی ہے تو اندھیرا خود بھاگ جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اگر صرف وہی کافی ہوتا تو قرآن مجید کی دس آیات میں دونوں کا تذکرہ ایک حیاتیاتی اکائی (organic whole) کے طور پر کیوں ہوتا؟ قرآن مجید (معاذ اللہ!) کوئی شاعری کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس میں لفاظی اور مبالغہ آمیزی ہے۔ اس میں جو لفظ اور جو بھی حرف آیا ہے‘ وہ اٹل اور لازم ہے اور اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ درحقیقت یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں‘ لیکن ان کو اگر علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھیں گے تو از روئے قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ نہی عن المنکر اہم تر ہے۔

اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث میں بھی صرف نہی عن المنکر کا ذکر ہے‘ اس میں امر بالمعروف کا تو ذکر سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس کے علاوہ میں نے اب تک جو دو احادیث آپ کے سامنے بیان کیں‘ پہلی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسری حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی‘ ان میں بھی صرف نہی عن المنکر کا ذکر ہے۔

نہی عن المنکر کے مراحل

زیر مطالعہ اربعین کی روایت میں نہی عن المنکر کے تین مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ تم میں سے جو کوئی بھی بدی کو دیکھے‘ اس کا فرض ہے کہ قوت سے اور بزورِ بازو اسے روکے۔ اگر آپ کے پاس قوت ہے تبھی تو قوت استعمال ہوگی۔ عام حالات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں بھی آپ کو قوت حاصل ہے وہاں یہ کام کرنا آپ کے لیے لازم ہو جائے گا۔ آپ اپنے گھر کے سربراہ ہیں تو اپنی فیملی کے اندر آپ پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ لازم ہوگا اور اگر آپ نہیں کرتے تو آپ مجرم شمار ہوں گے۔ البتہ آپ کا دوسروں کے اوپر ظاہر بات ہے کوئی زور نہیں چل سکتا تو وہاں آپ پر فرض نہیں ہوگا‘ اس لیے کہ آپ کو قوت حاصل نہیں ہے۔ آپ کا بچہ نماز نہیں پڑھتا‘ حالانکہ اس کے اوپر نماز فرض ہو چکی ہے تو آپ اسے مار سکتے ہیں‘ سزا دے سکتے ہیں‘ لیکن کسی دوسرے کے بچے کو آپ نہیں مار سکتے۔

اگر انسان میں بزورِ بازو برائی کو روکنے کی استطاعت نہ ہو تو پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان زبان سے برائی کو برا کہے۔ واضح رہے کہ عدمِ استطاعت کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ میں ہمت نہیں ہے کہ آپ کھڑے ہو کر اس باطل کا مقابلہ کر سکیں تو کم ہمتی کی وجہ سے بھی عدمِ استطاعت ہو سکتی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ماحول ایسا ہے کہ جس میں بولنا گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو‘ زبانوں پر تالے پڑ گئے ہوں تو اس صورت میں کم سے کم زبان سے تو بات کرو۔ یعنی اگر اس کے خلاف تمہارے پاس طاقت نہیں ہے تو زبان سے تو اسے برا کہو۔ اسی لیے فرمایا گیا: ((اَلَا اِنَّ اَفْضَلَ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ))(۱) ’’سن لو کہ افضل ترین جہاد یہ ہے کہ ایک ظالم حکمران کے سامنے حق کی بات کی جائے‘‘۔ اس کے افضل ہونے کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس میں اندیشہ ہوگا کہ وہ تمہاری گردن اڑا دے گا۔

نہی عن المنکر کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان کے پاس نہ بزورِ بازو برائی کو روکنے کی طاقت ہے اور نہ زبان سے برائی کو برا کہنے کی ہمت ہے۔ اب اس عدمِ استطاعت کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شخص گونگا ہے اور وہ بول ہی نہیں سکتا اور اس میں یہ بھی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ لکھ کر بات کر سکے۔ دوسرا یہ ہے کہ اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ مصائب کو برداشت کر سکے‘ تو اس صورت میں وہ کم از کم دل میں تو برائی کو برا جانے۔ آپ کسی اور کو تو بدل نہیں سکتے‘ لیکن دل کے اندر برائی کے خلاف نفرت کے ہونے سے کم از کم آپ اور آپ کے اہل و عیال اس برائی سے بچ جائیں گے اور آپ اس ماحول کے رنگ میں نہیں رنگے جائیں گے۔ لیکن اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کمزور ترین ایمان کی علامت ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ کمزور ترین ایمان کے بعد تو باقی نتیجہ یہی ہے کہ اس کے بعد ایمان نہیں ہے۔ یعنی آپ بدی کو دیکھیں اور آپ کو رنج و افسوس بھی نہ ہو‘ آپ کے احساسات پر جوں بھی نہ رینگے‘ آپ کو کوئی صدمہ بھی نہ ہو تو پھر ایمان سرے سے موجود نہیں ہے۔

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الفتن‘ باب ماجاء فی الامر بالمعروف و نهی عن المنکر۔

اس کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر آپ کا بچہ شدید بیمار ہے۔ آپ نے ہر طرح کا علاج کرا لیا ہے‘ ڈاکٹری علاج بھی کرا لیا‘ حکیموں سے علاج بھی کرا لیا‘ ٹونے ٹوٹکے سے بھی مدد لے لی‘ لیکن شفا نہیں ہو رہی۔ آپ بالکل بے بس ہیں اور کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا وہ بچہ اگر درد میں تڑپ رہا ہو تو آپ آرام سے سو جائیں گے؟ یہ تو نہیں ہوگا نا! اسی طرح اگر آپ بدی کو قوت کے ساتھ نہیں روک سکے یا بدی کے خلاف زبان سے بھی جہاد نہیں کر سکے تو کم سے کم دل سے تو نفرت کیجیے‘ جیسے کہ اپنے بچے کو دیکھ کر آدمی کو رنج ہوتا ہے‘ افسوس ہوتا ہے‘ صدمہ ہوتا ہے‘ کم سے کم یہ تو ہو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر آپ اپنے ایمان کی خیر منائیے۔

ناخلف لوگوں سے جہاد کے مراحل

قبل ازیں میں آپ کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا ترجمہ سنا چکا ہوں‘ اب میں چاہتا ہوں کہ اس حدیث کو ذرا وضاحت سے آپ کے سامنے رکھوں‘ اس لیے کہ اس میں نہی عن المنکر کے مراحل کا بہت تفصیل سے تذکرہ ہے اور اس میں اُمت کے لیے اس ضمن میں واضح راہنمائی آ جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ)) ’’کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے اللہ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا ہو‘‘ ((اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ)) ’’مگر یہ کہ لازماً اس کی اُمت میں سے کچھ نہ کچھ اصحاب اور کچھ نہ کچھ حواری ضرور ہوتے تھے‘‘۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواری تھے اور حواری کا لفظ خاص طور پر حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں کے لیے قرآن میں استعمال ہوا‘ جبکہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھیوں کے لیے صحابہ کا لفظ آیا ہے اور یہاں پر دونوں الفاظ اکٹھے آ گئے ہیں۔ یہ حواری اور اصحاب کیا کرتے تھے‘ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا وہ بلاغت و فصاحت کی بہت اونچی مثال ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ دو کام کرتے تھے‘ پہلا کام یہ کرتے تھے: ((يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ)) ’’اپنے نبی کی سنت کو مضبوطی سے تھامتے تھے‘‘ — جیسے ہم حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان پڑھ چکے ہیں: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ

الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ ، تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) ’’پس تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت (طریقہ) کو لازم پکڑنا اور اسے داڑھوں سے قابو کرنا‘‘ — دوسرا کام یہ کرتے تھے: ((وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ)) ’’اور اپنے نبی کے حکم پر عمل پیرا ہوتے تھے۔‘‘

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ)) ’’پھر (ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ) ان کے بعد ناخلف لوگ آ جاتے تھے‘‘۔ دیکھئے یہ عمرانیات کا بہت بڑا قاعدہ بیان ہو رہا ہے کہ ہر کمال کے بعد زوال بھی آتا ہے۔ ہر نبی کی آمد پر اس کے کچھ ساتھی بن گئے۔ ان کی کاوشوں سے معاشرے میں بہت نیکی پھیل گئی اور معاشرے میں بہت اچھائی آ گئی۔ وقت گزرتا گیا اور رفتہ رفتہ شیطان اپنا کام کرتا رہا۔ شیطان کے ایجنٹ انسانوں میں سے بھی ہیں اور جنات میں سے بھی‘ تو ان کی کارروائیوں سے پھر زوال تو آتا ہی ہے۔ جیسے حضور ﷺ کی جماعت کو بھی زوال آیا۔ خلافت راشدہ تیس برس تک قائم رہی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ملوکیت آ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ناخلف لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ کرتے کیا ہیں؟ دیکھئے رسول اللہ ﷺ کی فصاحت و بلاغت کہ آپؐ نے ان کے بھی دو ہی کام بتائے۔ پہلا یہ کہ: ((يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ)) ’’وہ کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے‘‘ یعنی نیکی کی ڈینگیں مارنا‘ اپنے تقویٰ اور تدین کا اشتہار دینا‘ یا لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنا لیکن خود اس پر عمل نہ کرنا۔ اور دوسرا کام یہ تھا کہ: ((وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ)) ’’اور وہ کرتے وہ کام تھے جن کا حکم ہی نہیں ہوا تھا‘‘۔ یعنی نئی سے نئی بدعات و رسومات‘ نئی سے نئی تقریبات‘ نئے سے نئے جشن۔

جب یہ ناخلف لوگ پیدا ہو جائیں تو پھر نبی کے بچے کھچے اصحاب و حواریوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے‘ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ’’پس جو بھی ان کے خلاف ہاتھ سے جہاد کرے گا تو وہ مؤمن ہے‘‘۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور میں نے اپنی کتاب میں اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے کہ کیا کسی

فاسق اور فاجر حاکم کے خلاف بغاوت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یہ ایک بڑا حساس معاملہ ہے۔ علماء کی اکثریت اسی بات کی قائل ہے کہ فاسق اور فاجر حکمران کے خلاف تب تک بغاوت جائز نہیں جب تک کہ وہ بدی کا حکم نہ دے۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ خود بدی کا ارتکاب کر رہا ہے‘ اس کے قول و فعل میں تضاد ہے‘ اس نے مختلف بدعات ایجاد کر لی ہیں اور وہ اپنے محل کے اندر عیاشیاں کر رہا ہے‘ لیکن وہ کسی کو بدی کا حکم نہیں دے رہا تو اس وقت تک اس کے خلاف خروج اور مسلح بغاوت کو علماء کی اکثریت صحیح نہیں سمجھتی۔ لیکن میں اس معاملے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا قائل ہوں کہ فاسق و فاجر حکمران کے خلاف بغاوت ہوسکتی ہے‘ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پہلے اتنی طاقت مہیا ہو جائے کہ کم سے کم ظاہری حالات و واقعات کے مطابق کامیابی یقینی نظر آئے۔ پھر کامیابی ملے یا نہ ملے‘ یہ بعد کی بات ہے ؎

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!

اگر آپ ایسے ناخلف لوگوں کے خلاف جہاد بالید یعنی قتال نہیں کر سکتے تو پھر اس کا اگلا درجہ یہ ہے: ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ’’اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے تو وہ بھی مؤمن ہے‘‘۔ قتال سے کم تر درجہ یہ ہے کہ زبان سے جہاد کرو‘ تنقیدیں کرو‘ برملا کرو‘ جلسوں میں کرو‘ سرعام کرو‘ چوکوں میں کھڑے ہو کر کرو‘ نعرہ لگاؤ کہ یہ غلط ہے! اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے قوت بہم پہنچے گی۔ اگر یہ نہیں کریں گے تو لوگ کیسے جمع ہوں گے اور بدی کا استیصال کرنے لیے طاقت کہاں سے آئے گی؟ اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ: ((وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) ’’اور جو ان کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے گا تو وہ بھی مؤمن ہے‘‘۔ دل سے جہاد یہ ہے کہ آپ کے دل میں اس کے لیے نفرت ہے۔ اگر آپ کے دل کے اندر واقعتاً نفرت ہوگی تو آپ کے وجود سے وہ ظاہر ہوگی۔ آپ تو خاموش رہیں گے‘ لیکن آپ کے وجود سے ظاہر ہوگا کہ آپ کو اس چیز سے نفرت ہے۔ آپ کا طرزِ عمل بتائے گا کہ آپ اس باطل کے ساتھ

تعاون تو نہیں کر رہے‘ آپ اس باطل کے تحت آرام سے پاؤں پھیلا کر تو نہیں سوتے۔ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کا جہاد ہے۔

اس آخری درجے کو بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) ’’اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے‘‘۔ اس سے آپ اندازہ کیجیے کہ اگر یہ نہیں ہے تو پھر ایمان نہیں ہے۔ کم سے کم دل سے نفرت‘ دل میں گھٹن‘ دل میں رنج و غم اور صدمہ تو ہونا چاہیے کہ یہ ماحول کدھر جا رہا ہے اور یہ کیا رنگ ہے جو ہمارے معاشرے پر چڑھتا جا رہا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بے حیائی‘ عریانی اور منکرات کا طوفان آ رہا ہے (آج کل تو منکرات اور بے حیائی و فحاشی کو ثقافت اور آرٹ کے بڑے خوبصورت نام دیے جا رہے ہیں) ان پر آپ کو رنج و صدمہ تو کم سے کم ہونا چاہیے۔ اگر یہ بھی نہیں ہے تو آپ کے اندر ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔

نہی عن المنکر نہ کرنے والے عابدوں کا انجام

آج کے موضوع کے حوالے سے ایک حدیثِ قدسی بہت چونکا دینے والی ہے۔ یہ حدیث مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرتب کردہ ’’خطباتِ جمعہ‘‘ میں موجود ہے۔ اکثر تھانوی مساجد میں یہ خطبے پڑھے جاتے ہیں اور خطبہ ثانیہ میں یہ حدیث پڑھی جاتی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرِيْلَ عليه السلام: اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا)) ’’اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو وحی کی کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں پر الٹ دو‘‘۔ ایسا عذابِ الٰہی قومِ لوط اور بہت سی قوموں پر آیا ہے۔ ((قَالَ: يَارَبِّ! اِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ)) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ’’اس پر حضرت جبرائیلؑ نے عرض کیا: پروردگار! ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے (جو اتنا نیک‘ اتنا زاہد اور اتنا عبادت گزار ہے) کہ اس نے کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی‘‘۔ اب کسی کی نیکی‘ تقویٰ اور زہد کا اندازہ آپ اس سے کیجیے کہ یہ گواہی دینے والے

حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں اور اللہ کی جناب میں گواہی دے رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اللہ کی جناب میں تو ابوجہل بھی جھوٹ نہیں بولے گا' اور فرشتے کے جھوٹ بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قَالَ ((فَقَالَ: اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ' فَإِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ))(۱) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الٹو ان بستیوں کو پہلے اس پر اور پھر دوسروں پر' اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ میری (غیرت اور حمیت کی) وجہ سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں بدلا''۔ فرض کیجیے آپ کو کوئی گالی دے اور آپ میں تھوڑی سی بھی طاقت ہے تو کیا آپ اسے جانے دیں گے؟ اگر طاقت نہیں ہے' گالی دینے والا بہت طاقتور ہے اور آپ کمزور ہیں تو کم سے کم آپ کا چہرہ تو سرخ ہو جائے گا نا! اس لیے کہ غیرت وحمیت کا بھی کچھ تقاضا ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث قدسی میں بھی اللہ عزوجل نے یہی فرمایا کہ اس کے چہرے کا رنگ تک کبھی نہیں بدلا' حالانکہ ان بستیوں کے اندر بدی پھیلتی رہی' ان میں منکرات کی اشاعت ہوتی رہی اور یہ آرام سے اپنی عبادت میں لگا رہا:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

معاشرے میں کیا ہو رہا ہے' اسے پتا ہی نہیں ہے۔ بس اپنی خانقاہ میں بیٹھا ہوا ہے' کوئی اگر آ گیا تو اسے کلمہ خیر سنا دیا' ورنہ کچھ نہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا! یعنی جو اس کے مرید ہو گئے ان کا تزکیہ تو وہ کر رہا ہے لیکن باقی ماحول سنسان ہے۔ باہر نکل کر وہ اپنا کردار ادا نہیں کر رہا' جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین وادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری!

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح' کتاب الآداب' باب الامر بالمعروف' الفصل الثالث

نہی عن المنکر نہ کرنے والے عذاب سے مستثنیٰ نہیں!

اب میں تیسری بات آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ کسی معاشرے میں اگر کوئی بدی جڑ پکڑ جائے اور اتنی پھیل جائے کہ پھر وہ معاشرہ عذابِ الٰہی کا مستحق ہو جائے تو اس صورت میں جو عذاب آتا ہے' قرآن مجید کے دو مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوتے ہیں جو بدی کے خلاف آواز اٹھاتے رہیں' حکم دیتے رہیں' اپنی سی کوشش کرتے رہیں' باقی سب اس عذاب کی پکڑ میں آ جاتے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں بنی اسرائیل کے ایک خاص قبیلے کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ وہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ آباد تھا اور ان کا ذریعہ معاش ماہی گیری تھا' یعنی مچھلی پکڑنا' اسے کھانا بھی اور بیچنا بھی۔ یہودیوں کے ہاں چونکہ یوم السبت کی حرمت ہے —— اصل میں تو ان کے لیے حرمت والا دن یوم الجمعہ ہی تھا' لیکن انہوں نے خود اپنی شرارتِ نفس سے یوم السبت اپنا لیا' اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر اسی کی حرمت لازم قرار دے دی —— چنانچہ ہفتہ کا پورا دن ان کے لیے ہر قسم کا کاروبارِ زندگی حرامِ مطلق تھا۔ اس قدر سخت حکم تھا' جبکہ ہمارے ہاں یہ حکم صرف جمعہ کی اذان سے لے کر نمازِ جمعہ کی ادائیگی تک ہے۔ فحوائے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الجمعة)

''اے ایمان والو! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔ پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو یاد کرو کثرت سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

یعنی جب اذان ہو جائے تو تمام کاروبار چھوڑ کر جمعہ کے لیے نکل کھڑے ہو اور جب جماعت سے فارغ ہو جاؤ تو کاروبار جائز ہے' بلکہ امر کے صیغہ میں فرمایا کہ جاؤ اللہ کا

فضل تلاش کرو! کس قدر آسانیاں ہیں شریعتِ محمدیؐ میں۔ یہی حکم اگر چوبیس گھنٹوں پر پھیلا دیا جائے کہ جمعرات کے غروبِ شمس سے اگلے دن کے غروب تک ہر طرح کا کاروبار حرام ہے تو یقیناً یہ سخت حکم ہوگا۔ یہودیوں پر یہ حکم ہفتہ کے دن کے لیے تھا کہ پورا دن کوئی کاروبار نہیں کرنا۔ وہاں معاملہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو بھی شعور دیا ہے تو مچھلیوں کو اندازہ ہو گیا کہ ہفتہ کا ایک دن ایسا ہے جس میں یہ ہمیں پکڑتے ہی نہیں‘ جبکہ باقی چھ دن تو ہماری جان پر بنی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہفتے کے دن مچھلیاں ساحل کے قریب اس شان سے آتی تھیں کہ اٹھلا رہی ہیں‘ چھلانگیں لگا رہی ہیں اور یہ بیچارے ’’ٹک ٹک دیدم‘ دم نہ کشیدم‘‘ کے مصداق دیکھ رہے ہیں‘ لیکن پکڑ نہیں سکتے‘ اس لیے کہ یہ حرام ہے۔

اس پر شیطان نے انہیں ورغلایا کہ کوئی حیلہ کرو تو انہوں نے یہ حیلہ کیا کہ ہفتہ کے دن ساحل سمندر کے قریب بڑے بڑے گڑھے کھودتے اور نہر کی شکل میں سمندر کا پانی ان میں لے آتے تو مچھلیاں بھی پانی کے ساتھ ان گڑھوں میں آ جاتیں اور شام کو ان کی واپسی کا راستہ بند کر دیتے۔ مچھلیاں ان تالاب نما گڑھوں میں محصور ہو کر رہ جاتیں اور وہ اگلے روز اتوار کو جا کر انہیں پکڑ لیتے تھے۔ یہ ہوتا ہے حیلہ۔ یوم السبت کی اصل حکمت تو یہ تھی کہ ہفتہ کا پورا دن تم یادِ الٰہی‘ عبادت و ریاضت اور دعا و مناجات میں بسر کرو‘ تورات کی تلاوت کرو۔ یعنی اس دن دنیوی کاروبار نہ کرو اور یہ کام کرو! لیکن وہ کام تو تم نے کیا نہیں۔ ٹھیک ہے تم نے مچھلیاں نہیں پکڑیں‘ لیکن سارا دن تو لگے رہے گڑھے کھودنے‘ مچھلیوں کو ادھر لانے اور یہاں پر انہیں بند کرنے میں۔ اس حیلہ پر قوم تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو دھڑلے سے یہ کام کر رہے تھے۔ ایک وہ تھے کہ جو خود تو یہ نہیں کر رہے تھے لیکن کرنے والوں کو روکتے بھی نہیں تھے۔ خاموش تھے کہ دفع کرو انہیں‘ جو کرتے ہیں کرتے رہیں‘ ہمیں کیا! ایک وہ تھے جو خود یہ کام کرتے بھی نہیں تھے اور کرنے والوں کو روکتے بھی تھے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٥﴾﴾ (الاعراف)

’’پھر جب انہوں نے نظر انداز کر دیا اس نصیحت کو جو انہیں کی جا رہی تھی‘ تو ہم نے بچا لیا ان کو جو برائی سے روکتے تھے اور پکڑ لیا ہم نے ان کو جو ظلم کے مرتکب ہوئے تھے بہت ہی برے عذاب میں‘ ان کی نافرمانی کے سبب۔‘‘

اب یہاں پر ایک تفصیل طلب نکتہ ہے۔ بعض لوگ جو رجائیت پسند ہیں اور روشن پہلو لوگوں کے سامنے زیادہ رکھنا چاہتے ہیں‘ ان کا کہنا یہ ہے کہ جن لوگوں نے واقعی حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی ان پر تو عذاب آیا اور جنہوں نے ان کو روکا ان پر نہیں آیا‘ لیکن جنہوں نے روکا نہیں ان کا ذکر یہاں پر نہیں ہے۔ گویا ان کے بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ انہوں نے روکا تو نہیں‘ لیکن ظاہر بات ہے انہوں نے خود تو گناہ کا ارتکاب نہیں کیا‘ لہٰذا ان کے لیے بھی بچاؤ کا ایک راستہ نکل آتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے ان کو بھی بچا لے گا۔ لیکن اکثر مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور نہی عن المنکر نہ کرنے والوں کے لیے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ انہوں نے نہی عن المنکر نہ کر کے گناہ کا ارتکاب کیا‘ اس لیے کہ انہیں حکم تھا کہ بدی سے روکیں‘ لیکن جب نہیں روکا تو انہوں نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی‘ تو فسق (نافرمانی) کا ارتکاب کرنے والوں کے اندر یہ بھی شامل ہیں۔ چنانچہ جنہوں نے روکا نہیں ان پر بھی وہ عذاب آیا۔ چنانچہ سورۃ الانفال میں دوٹوک الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ﴾ (آیت ۲۵)

’’اور بچو اُس عذاب سے جو خاص طور پر صرف گناہگاروں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا۔‘‘

یعنی پھر گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ یہی بات سورۂ ہود میں بایں الفاظ کہی گئی ہے:

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِى الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۱۶)

’’تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں حق کے ایسے علمبردار ہوتے جو (اپنی اپنی قوموں کے لوگوں کو) روکتے زمین میں فساد مچانے سے‘ مگر بہت تھوڑے لوگ ایسے تھے‘ جنہیں ہم نے اُن میں سے بچا لیا۔‘‘

معلوم ہوا کہ عمومی عذاب سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ بدی سے روکنے کا عمل جاری رکھیں‘ ورنہ آپ بھی عذابِ الٰہی کی زد میں ہوں گے۔

صدیقین کے درجے کے مستحق کون؟

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے‘ بدی سے روکنے میں تینوں درجے شامل ہو جائیں گے۔ دل میں بدی سے حقیقتاً نفرت ہو تب بھی اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا‘ لیکن زبان سے بات کرنا اس سے اوپر کا درجہ ہے اور قوت کے ساتھ روکنا بلند ترین کا درجہ ہے۔ قوت موجود نہیں ہے تو اس مقصد کے لیے قوت حاصل کرنے کی کوشش کرنا اس کا قائم مقام ہو جائے گا۔ جیسے کہ حدیث میں آیا ہے:

((مَنْ جَاءَ هُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ))(۱)

’’جس شخص کو موت آ گئی اس حال میں کہ وہ اس نیت کے ساتھ علم حاصل کر رہا تھا کہ اس کے ذریعے دین اسلام کو زندہ کرے گا تو جنت میں اُس کے اور نبیوں کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہو گا۔‘‘

ظاہر بات ہے کہ اس علم سے ایمان اور شریعت والا علم ہی مراد ہو گا جس کے ذریعے سے شریعت کو زندہ کیا جائے‘ نافذ کیا جائے۔ اگر کوئی شخص یہ علم حاصل کر رہا تھا اور ابھی وہ فارغ التحصیل بھی نہیں ہوا تھا‘ لیکن احیاء دین کی نیت سے پورے تن من دھن کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس حال میں اس کو موت آ گئی تو اس کے لیے اتنی بڑی خوشخبری ہے کہ جنت میں اس کے اور نبیوں کے درمیان ایک درجہ کا فرق ہو گا۔ یعنی وہ صدیقین میں شمار ہو گا‘ اس لیے کہ انبیاء کے بعد صدیقین کا درجہ ہے۔

فریضہ نہی عن المنکر سے پہلوتہی پر بنی اسرائیل کا انجام

آخر میں‘ میں آپ کے سامنے بنی اسرائیل کا تذکرہ کروں گا۔ نہی عن المنکر سے پہلوتہی اور اعراض کا معاملہ اہل کتاب میں بھی ہو گیا تھا اور اسے اُمتِ مسلمہ کے لیے گویا تنبیہہ کے طور پر قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوا:

﴿لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ

(۱) رواہ الدارمی‘ عن الحسن مرسلاً۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح‘ کتاب العلم‘ الفصل الثالث۔

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ (المائدۃ)

’’کیوں نہیں منع کرتے انہیں ان کے درویش (صوفی اور پیر و مرشد) اور علماء و فقہاء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے؟ بہت ہی برا ہے وہ کام جو وہ کر رہے ہیں۔‘‘

یعنی بنی اسرائیل کے اولیاء اللہ‘ صوفیاء‘ مشائخ‘ احبار یا بڑے بڑے علماء نے اپنے لوگوں کو گناہ کی بات زبان سے کہنے اور حرام خوری سے کیوں نہیں روکا؟ جب انہوں نے اپنے فرضِ منصبی کو ادا کرنے سے اعراض کیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو اس مقام و منصب سے معزول کر دیا جو ان کو عطا ہوا تھا اور پھر ہماری اُمت کو اُمتِ مسلمہ کا درجہ دے دیا گیا۔ اسی منصب پر ہم سے پہلے بنی اسرائیل دو ہزار برس تک فائز رہے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اب ہمیں بھی چودہ سو برس ہو گئے ہیں۔ بحیثیتِ اُمت ان کی تاریخ شروع ہوتی ہے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام تک چودہ سو برس کا عرصہ تھا۔ بنی اسرائیل کے خلاف قرآن مجید میں جو فردِ جرم آئی ہے‘ ان جرائم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے راہب اور علماء اپنی قوم سے نذرانے لیتے رہے‘ ان سے خدمتیں اور اکرام کراتے رہے‘ لیکن انہیں بدی سے نہیں روکا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ان کے جرائم میں سے ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اسی لیے فرمایا:

﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾ (المائدۃ)

’’(ان لوگوں کے جرائم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ) وہ نہیں روکتے تھے ایک دوسرے کو اس منکر سے جو وہ کرتے تھے۔ بہت ہی بری ہے وہ بات جو وہ کر رہے تھے۔‘‘

اس ضمن میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلے جو خرابی پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ ان کے علماء لوگوں کو روکتے تو تھے کہ یہ غلط کام ہے‘ یہ برا کام ہے‘ لیکن ان کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے سے احتراز نہیں کرتے تھے‘ ان کے دسترخوانوں پر جا کر بہترین‘ لذیذ اور مرغن کھانے کھاتے تھے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو بھی ویسا ہی خراب کر دیا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

((لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ فِی الْمَعَاصِیْ نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ فَلَمْ یَنْتَهُوْا، فَجَالَسُوْهُمْ فِیْ مَجَالِسِهِمْ وَوَاکَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ، فَضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ وَلَعَنَهُمْ عَلٰی لِسَانِ دَاوُدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ، ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ)) (۱)

''جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہو گئے تو (ابتدا میں) اُن کے علماء نے اُن کو ان سے روکا لیکن جب وہ باز نہ آئے، لیکن (اس کے باوجود) انہوں نے اُن کی ہم نشینی اور ان کے ساتھ باہم کھانا پینا جاری رکھا تو (اس کے نتیجے میں) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو بھی باہم مشابہ کر دیا اور پھر ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبانی لعنت فرمائی، اور یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے تھے۔''

الغرض منکرات سے دل میں نفرت، جسے کمزور ترین ایمان قرار دیا گیا ہے، کا تقاضا یہ ہے کہ برائی کا ارتکاب کرنے والے لوگوں کے ساتھ دوستی نہ رکھی جائے۔ آپ ہر رات کو دعائے وتر میں اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتے ہیں: وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ یَفْجُرُكَ ''اے اللہ! جو بھی تیری نافرمانی کرے ہم اس سے ترکِ تعلق کرتے ہیں اور اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں''۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ لیکن اگر بالفعل ان سے ترکِ موالات نہیں ہے، انہی میں گھل مل رہے ہیں، ہنسی اور گپ شپ ہو رہی ہے تو یہ ایمان کی نفی ہے۔ ان سے ملاقاتیں کرنی ہیں تو دعوتِ دین کی خاطر کریں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے کریں —— ورنہ برائی سے نفرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کے ساتھ سوشل بائیکاٹ کیا جائے اور اس طرح کم سے کم اپنے آپ کو بچا لیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتoo

(مرتب: حافظ محمد زاہد، ادارتی معاون، شعبہ مطبوعات)

---

(۱) سنن الترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة المائدة۔

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں (۲)

پروفیسر ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

چوتھا اصول:

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ﴿۱۵﴾﴾

''بلکہ انسان اپنے نفس کو خوب جانتا ہے' بھلے کتنے ہی عذر تراشتا رہے۔''

اپنے نفس کے ساتھ معاملہ کرنے اور اسے پاک کرنے کے باب میں جو اصول کام آتے ہیں ان میں سے ایک اصول یہ ہے اور یہ نفس کی بیماریوں کے علاج کا ذریعہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم مقصد کو بیان کرنے کے لیے ''سورۃ الشمس'' میں گیارہ قسمیں کھائی ہیں' پھر فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿۹﴾﴾ (الشّمس)

''جس نے اس نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہوا۔''

اس اصول کا خلاصہ: یہ ہے کہ انسان اگرچہ اپنے کاموں اور باتوں کا دوسروں کے سامنے دفاع کر لے' لیکن اس کا دل جانتا ہے کہ وہ غلطی پر ہے' اور اپنے لیے چاہے سو بہانے گھڑ لے' لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے چھپا سکتا ہے اور عذر بھی تراش سکتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کے بعد وہ اپنے نفس کے بارے میں سب سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔

ہماری ذاتی اور معاشرتی زندگی میں اس اصول کے بہت زیادہ مواقع آتے ہیں' چند ایک کا تذکرہ کر دیتا ہوں' تاکہ ہم اپنی غلطیوں کی اصلاح میں اس سے فائدہ اُٹھا سکیں اور ہمارے کردار میں جو کج روی آ چکی ہے اسے ٹھیک کر لیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) بعض لوگوں کا شرعی احکام کے ساتھ سلوک: قرآنِ کریم یا صحیح حدیث کا حکم موجود

ہے' دلیل واضح ہے' اس میں کوئی اشکال بھی نہیں' دلیل اس قدر واضح ہے کہ اس کے واجب یا حرام ہونے میں علماء کا اختلاف بھی نہیں' اس سب کے باوجود کسی شخص کا دل تنگ ہو رہا ہوتا ہے' اس کی ہزار کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس آیت یا حدیث کے حکم سے جان خلاصی کروالوں' اس لیے کہ یہ حکم اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ اس قسم کا حیلہ اس کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتا اور نہ ہی اس کو اللہ تعالیٰ کے ہاں نجات دلا سکتا ہے' اس لیے کہ انسان اپنے نفس کو خوب جانتا ہے۔ مؤمن کا مقام تو یہ ہے کہ اس آیت کا عملی نمونہ ہو:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۶۵﴾﴾ (النساء)

''سو قسم ہے تیرے پروردگار کی' یہ مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپس کے تمام اختلاف میں آپ کو حَکم نہ مان لیں' پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان کے بارے میں اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور اسے فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں۔''

(۲) اپنے نفس کے ساتھ معاملہ کرنے میں: بعض لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے کہ بس لوگوں کی غلطیاں تلاش کی جائیں اور اپنی غلطیوں سے غافل رہیں۔ یہ ناکامی اور بدقسمتی کی انتہا ہوتی ہے۔ اہلِ علم کا قول ہے جب تم دیکھو کہ کوئی انسان دوسروں کی غلطیوں کو تلاش کر رہا ہے اور اپنی غلطیوں سے غافل ہے تو جان لو کہ وہ اللہ کی پکڑ میں آنے والا ہے۔

(۳) اپنی غلطیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں: بسا اوقات آپ کو نظر آئے گا کہ ایک آدمی کی غلطی سامنے آ گئی' اب وہ اپنے دفاع میں لوگوں سے بحث و تکرار کر رہا ہے' حالانکہ اسے خوب علم ہے کہ وہ غلطی پر ہے۔ بس وہ اپنے عذر پیش کیے جا رہا ہے اور بحث کیے جا رہا ہے اور لوگوں کو حقیقت کے خلاف نقشہ دکھا رہا ہے۔

(۴) اس مبارک اصول کا فائدہ: یہ ہے کہ انسان اپنے عیبوں کو تلاش کرے اور حسبِ استطاعت ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرے۔ یہ کام قابلِ تعریف جہاد کے زمرے میں آتا ہے۔ اور اپنی غلطیوں یا برے کاموں پر ڈٹا رہنے کی کوشش نہ کرے اور دلیل یہ پیش کرے کہ وہ بچپن سے یہ کام کرتا آ رہا ہے یا یہ تو اس کی عادت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان اپنے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہے۔ اسے اپنے برے کاموں کا بھی علم ہے' اپنی غلطیوں کو بھی جانتا ہے' اپنے گناہوں سے بھی واقف ہے' اور اپنے رازوں کو بھی جانتا ہے۔

(۵) اس اصول کو نافذ کرنے کی سب سے عمدہ شکل: اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو

گناہ کے اعتراف کی توفیق مل جائے یہ انبیاء' صدیقین اور نیک لوگوں کا مقام ہے۔ اس کی مثال ہمارے جدِامجد اور اماں یعنی حضرت آدم وحواء علیہما السلام کی ہے کہ ان دونوں نے جب ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا تو عرض کیا:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾﴾ (الاعراف)

''دونوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا' اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔''

اور جب حضرتِ موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے ہاتھوں ایک قبطی قتل ہوگیا تو آپؑ نے شرمسار ہوکر عرض کیا:

﴿رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦﴾﴾ (القصص)

''اے پروردگار! میں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا' پس تُو مجھے معاف فرمادے' تو اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔ یقیناً وہ بخشش اور بہت مہربانی کرنے والا ہے۔''

میں اللہ کریم سے دعا گو ہوں کہ ہمیں اپنے گناہوں پر نظر کرنے کی توفیق دے اور ہمیں ہمارے اپنے گناہوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین!

پانچواں اصول:

﴿وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى﴾

''جس نے جھوٹی بات گھڑی' وہ کبھی کامیاب نہ ہوگا۔''

سیدنا موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کا جو واقعہ فرعون اور اس کے بلائے ہوئے جادوگروں کے ساتھ پیش آیا' یہ اصول اس کے پس منظر میں بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾﴾ (طٰہٰ)

''موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ زینت اور جشن کے دن کا وعدہ ہے' اور یہ کہ لوگ دن

چڑھے ہی جمع ہوجائیں۔ پس فرعون لوٹ گیا اور اس نے اپنے ہتھکنڈے جمع کیے پھر آگیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: تمہاری شامت آچکی ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور افتراء نہ باندھو کہ وہ تمہیں عذابوں سے ملیامیٹ کردے۔ یاد رکھو وہ کبھی کامیاب نہ ہوگا جس نے جھوٹی بات گھڑی۔''

لفظ افتراء کے کئی معنی ہوتے ہیں' مثلاً: جھوٹ بولنا' شرک کرنا' ظلم کرنا۔ قرآنِ کریم میں یہ تینوں معنی بیان ہوئے ہیں' سب کا مرکزی نکتہ فساد کرنا اور خراب کرنا ہے۔ مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں بہتان بازوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ اصول بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ ناکام رکھتا ہے اور ان کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ جب تم اس اصول پر غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کے نصیب میں ناکامی وگمراہی لکھی ہوتی ہے۔ انہی میں سے یہ لوگ ہیں:

(۱) بغیر کسی علم کے زبان سے اللہ تعالیٰ پر بہتان تراشی کرنا' خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۭ﴾ (الانعام:۹۳)

''اور اُس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کی تہمت لگائے یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی وحی نہیں آئی اور جو شخص یوں کہے کہ جیسا کلام اللہ نے نازل کیا ہے اسی طرح کا میں بھی لاتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ پر الزام تراشوں کی فہرست میں وہ لوگ بھی آتے ہیں جو بغیر علم کے فتویٰ جاری کردیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ پر الزام تراشی کرنے والوں میں شمار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل میں فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿١١٦﴾﴾

''کسی چیز کو اپنی زبان سے جھوٹ موٹ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے' کہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھ لو۔ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ پر بہتان بازی کرنے والے کامیابی سے محروم ہی رہتے ہیں۔''

جو شخص کسی مسئلے میں بات کرنا چاہے اور اس کے پاس علم بھی نہ ہو تو اسے چاہیے کہ

خاموشی اختیار کرے‘ اور جو شخص لوگوں کو فتوے دیتا ہو وہ اس باب میں سلف صالحین کے طریقے پر عمل کرے‘ اس لیے کہ وہ بہتر اور اچھا طریقہ ہے۔

(۲) پرانے زمانے میں اور جدید دور میں حدیثیں گھڑنے والے جو کچھ کر رہے ہیں یہ اللہ کے رسول ﷺ کے نام پر جھوٹ بولتے ہیں اور آپؐ پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ یا تو اپنے خیال کے مطابق اچھی نیت کے ساتھ‘ جیسے ترغیب وترہیب کی حدیثیں ہیں‘ یا سیاسی مقاصد کے تحت یا مذہبی یا تجارتی اغراض کے تحت حدیثیں گھڑتے ہیں۔ اور مقامِ افسوس ہے کہ یہ سلسلہ عرصہ دراز سے جاری ہے۔ جو لوگ بھی آپ ﷺ کے نام پر حدیثیں گھڑتے ہیں اگر ان کو یہ احساس ہو جائے کہ ان کا شمار افترا پردازوں میں ہوتا ہے اور ان کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی‘ بلکہ خسارہ ان کا مقدر ہے‘ تو عین ممکن ہے کہ بہت سے لوگ اپنی اس حرکت سے باز آ جائیں۔ دین کو تو اللہ تعالیٰ نے مکمل کر رکھا ہے‘ اس کو کسی من گھڑت یا مصنوعی حدیث کی قطعاً ضرورت نہیں۔

(۳) اس اصول کی عملی شکلوں میں سے یہ بھی ہے جو ظلم اور بہتان انتہائی افسوس کے ساتھ بعض لوگوں کی طرف سے اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کے بہت سارے اسباب ہوتے ہیں‘ شاید اس کی سب سے بڑی وجہ حسد ہوتی ہے (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے) یا دنیوی فائدے کا لالچ یا کوئی اور سبب۔ اور اس وقت مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے جب لوگ اپنی غلط حرکتوں کو دینی رنگ میں پیش کرتے ہیں اور وہ ظاہر یہ کرتے ہیں کہ میں نے تو یہ بات فلاں آدمی کی غلط کاری بیان کرنے کے لیے کی تھی اور لوگوں کو اس کے شر سے بچانے کے لیے ایسا کہا تھا‘ حالانکہ وہ اپنی ذاتی دشمنی کی خاطر ایسا کہہ رہا ہوتا ہے۔

اس حوالے سے میرے سامنے بہت سارے واقعات آئے ہیں‘ کچھ پُرانے‘ کچھ نئے۔ متعلقہ اشخاص نے اپنے کرتوتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ یہ ایسے خوفناک انجام ہیں جن پر دل خون کے آنسو روتا ہے‘ جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے‘ جو انجام الزام تراشنے والوں کا ہوا اور جو جو نتائج ان کو بھگتنے پڑے۔ اس موقع پر صرف ایک واقعہ بیان کرنا ہی کافی ہوگا‘ شاید کہ اسی میں عبرت ونصیحت ہو۔

ایک عورت نے بیان کیا کہ وہ خود یونیورسٹی کی پروفیسر ہے اور اسے دو دفعہ طلاق ہو چکی ہے۔ وہ بیان کرتی ہے کہ سات سال پہلے میں نے ظلم کمایا کہ جب مجھے دوسری دفعہ طلاق ہوئی تو میں نے اپنے ایک رشتہ دار سے شادی کا فیصلہ کیا‘ جو اپنی بیوی اور پانچ بچوں کے ساتھ بڑی خوشگوار زندگی گزار رہا تھا۔ میں نے اپنے خالہ زاد کے ساتھ مل کر سازش تیار کی‘ اور میرا خالہ زاد

اِس آدمی کی بیوی کو پسند کرتا تھا۔ ہم نے مل کر طے یہ کیا کہ ہم اس کی بیوی پر زنا کا الزام لگاتے ہیں‘ چنانچہ ہم نے خاندان میں افواہیں پھیلانا شروع کر دیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں کامیابی ملنی شروع ہوگئی‘ ہمارے شکار میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں دراڑیں پڑ گئیں اور بالآخران دونوں کے درمیان میں طلاق ہوگئی۔

جس عورت کو افواہوں کی وجہ سے طلاق ہوئی تھی‘ ایک سال بعد اس کی ایک بڑے افسر سے شادی ہوگئی‘ اور طلاق دینے والے مرد نے مجھے چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے شادی کر لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرے ہاتھ کچھ نہ لگا اور نہ میرے خالہ زاد کو مراد ملی۔ البتہ ہمیں اپنے ظلم کی سزا ضرور مل گئی کہ مجھے خون کا کینسر ہو گیا اور میرا خالہ زاد جس فلیٹ میں رہتا تھا‘ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے اس میں آگ لگی اور وہ ایک دوسرے ساتھی کے ہمراہ جل کر راکھ ہو گیا۔

چھٹا اصول:

﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ ’’صلح بہت اچھی بات ہے!‘‘

معاشرے کی تعمیر واصلاح کرنے والے اصولوں میں سے ایک اصول ’’صلح‘‘ ہے‘ اور یہی اصول معاشرے کو ٹوٹ پھوٹ سے بچاتا ہے۔ بعض دفعہ میاں بیوی کے درمیان ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان میں اختلاف اور دوری جنم لے لیتی ہے۔ ان حالات میں ایسی صلح جو ان دونوں کو قابل قبول ہو‘ بہر حال جدائی سے بہتر ہے۔ اسی اُصول کو پختہ کرنے کے لیے یہ قاعدہ بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾﴾ (النساء)

’’اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی بد دماغی اور بے پرواہی کا خوف ہو تو دونوں آپس میں صلح کر لیں تو اس میں کسی پر کوئی گناہ نہیں۔ اور صلح بہت بہتر چیز ہے۔ طمع ہر ہر نفس میں شامل کر دی گئی ہے۔ اگر تم اچھا سلوک کرو اور پرہیز گاری کرو‘ تو تم جو کر رہے ہو اس پر اللہ تعالیٰ پوری طرح خبردار ہے۔‘‘

ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں اصلاح کے حوالے سے جتنی بھی آیتیں نازل ہوئی ہیں وہ اسی قرآنی قاعدے کی عملی تفسیر ہیں۔

آیتِ مبارکہ کا خلاصہ: جب عورت محسوس کرے کہ اس کا خاوند اس سے بے نیاز ہوتا جا رہا ہے اور اسے اس عورت میں کوئی دلچسپی نہیں رہی‘ بلکہ اس سے منہ موڑ رہا ہے‘ تو ایسے حالات میں بہتر یہی ہے کہ وہ آپس میں کوئی صلح کی شکل پیدا کر لیں۔ عورت اپنے کچھ ضروری حقوق چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ زندگی گزار سکے یا ضروریاتِ زندگی کے اخراجات مثلاً لباس‘ رہائش وغیرہ میں سے کچھ کم پر سمجھوتا کر لے‘ یا اپنے جسمانی حق سے دست بردار ہو جائے اور رات کا حق اپنے خاوند کی مرضی پر چھوڑ دے‘ یا دوسری بیوی کے حق میں دست بردار ہو جائے۔ اگر وہ دونوں کسی بات پر بھی اتفاق کر لیتے ہیں تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے‘ نہ بیوی پر گناہ ہے اور نہ ہی خاوند گنہگار ہے۔ ایسی صورت میں خاوند کا اپنی بیوی کے ساتھ رہنا جائز ہے۔ یہ صورتِ حال جدائی سے بہر حال بہتر ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ﴾
’’اور صلح بہتر چیز ہے۔‘‘

جو آدمی قرآنِ حکیم پر غور کرے اُسے معلوم ہوگا کہ عملاً اس اصول پر عمل کرنے کی بہت گنجائش موجود ہے‘ جیسا کہ میاں بیوی کے درمیان صلح کا معاملہ ہے۔ اسی طرح لڑائی کرنے والے دو گروہوں کے درمیان بھی صلح کا حکم ہے اور جو لوگ اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی کھل کر تعریف فرمائی ہے۔ فرمایا:

﴿لَا خَيۡرَ فِيۡ كَثِيۡرٍ مِّنۡ نَّجۡوٰٮهُمۡ اِلَّا مَنۡ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوۡ مَعۡرُوۡفٍ اَوۡ اِصۡلَاحٍۢ بَيۡنَ النَّاسِ‌ؕ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ فَسَوۡفَ نُـؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا﴿۱۱۴﴾﴾ (النساء)

’’ان کے اکثر خفیہ مشوروں میں کوئی خیر نہیں‘ ہاں بھلائی اس کے مشورے میں ہے جو خیرات کا یا نیک بات یا لوگوں میں صلح کرانے کا حکم کرے‘ اور جو شخص صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے ارادہ سے یہ کام کرے اسے ہم یقیناً بہت بڑا ثواب دیں گے۔‘‘

لوگوں کے درمیان صلح کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اگر صلح کی کوشش کرنے والا اس وجہ سے مقروض بھی ہو جائے تو شریعت نے اس کو زکوٰۃ لینے کی اجازت دی ہے۔

لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ ہمیں قرآن کے اس اصول سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور ہمیں اپنی عملی زندگی میں اس کو وسعت دینی چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں ہمارے لیے سچا نمونہ موجود ہے کہ آپؐ نے زندگی بھر اس اصول کو اپنایا۔ آپ ﷺ کی ساری زندگی کا وظیفہ ہی یہی تھا کہ صلح کرائی جائے اور اصلاح کی جائے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) جب آپ ﷺ کی اہلیہ اُمّ المؤمنین سیدہ سودہ بنت زمعہ ؓ بڑی عمر کی ہوگئیں تو (بعض وجوہات کی بنا پر) آپ ﷺ نے خیال کیا کہ انہیں طلاق دے دیں۔ حضرت سودہ بہت دانا عورت تھیں‘ انہوں نے آپ ﷺ سے اس شرط پر صلح کر لی کہ آپ انہیں بیوی بنا کر رکھیں گے اور وہ اپنی باری کا دن سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ کو دے دیں گی۔ آپ ﷺ نے یہ صلح قبول فرما لی اور اسے اسی حال پر باقی رکھا۔

(۲) آپ ﷺ کو خبر ہوئی کہ اہلِ قباء کے درمیان لڑائی ہوگئی ہے اور انہوں نے باہم پتھراؤ کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِذۡهَبُوۡا بِنَا نُصۡلِحُ بَيۡنَهُمۡ)) (صحیح البخاری‘ ح:۲۵۴۷)

’’ہم مل کر چلتے ہیں اور ان کے درمیان صلح کرواتے ہیں۔‘‘

جو شخص سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ کئی درخشاں مثالیں موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے مختلف مواقع پر لوگوں کے درمیان صلح کروانے کا کردار ادا کیا۔

ہمارے لیے بڑی خوشی کا مقام ہے کہ باہمی اصلاح کمیٹیاں بن گئی ہیں‘ اور یہ اس قرآنی اصول کی عملی تفسیر ہے‘ جس میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ﴾ کہ صلح بہتر چیز ہے۔ مبارک ہو ان بابرکت لوگوں کو جن کو اللہ تعالیٰ نے بہترین لوگ قرار دیا ہے‘ جو لوگوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے‘ اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے۔

ساتواں اصول:

﴿مَا عَلَى الۡمُحۡسِنِيۡنَ مِنۡ سَبِيۡلٍ‌ؕ﴾

’’محسنین پر کوئی الزام نہیں۔‘‘

انسانوں کے ساتھ معاملات کرنے کے بارے میں یہ اصول بیان ہوا ہے۔ غزوۂ تبوک رجب نو ہجری میں پیش آیا۔ اس واقعے کے پس منظر میں قرآن حکیم نے یہ اصول بیان کیا ہے۔ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہنے والے کئی قسم کے لوگ تھے‘ اب سوال یہ تھا کہ کن لوگوں کا عذر قابل قبول ہے اور کن کا عذر قبول نہیں ہوسکتا؟

اس اصول کا مختصر تعارف: جو شخص جہاد سے کسی حقیقی عذر کی وجہ سے غیر حاضر رہا اس پر کوئی گناہ نہیں اور نہ ہی کوئی حرج ہے۔ مثلاً وہ جسمانی طور پر کمزور تھا یا مالی کمزوری تھی۔

اس اصول کی حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کی کوئی ذمہ داری اس وقت تک نہیں بنتی جب تک شریعت اس پر ذمہ داری نہ ڈالے‘ لہٰذا مذکورہ بالا آیت کے عمومی معنیٰ یہ ہیں کہ اصولی طور پر ہر انسان دوسرے انسان کی ذمہ داری سے بری ہے اِلّا یہ کہ کوئی ذمہ داری قانونی طریقے سے ثابت ہو جائے۔

اس اصول کی عملی شکل یوں ہوتی ہے: ہماری زندگی میں بہت سارے مواقع آتے ہیں جس میں احسان کا دروازہ کھلتا ہے۔ بہت سارے لوگوں کو موقع ملتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ نیکی کر سکیں اور کسی قسم کی خدمت کر سکیں۔ سب سے زیادہ یہ موقع گھر کے افراد مثلاً بیوی یا خاوند یا اولاد کو ملتا ہے۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ یہ لوگ اس قرآنی اصول کے اُلٹ چلتے ہیں۔ اہل خانہ تو نیکی اور احسان کر رہے ہوتے ہیں اور یہ لوگ اُلٹا انہی کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ انہیں خبر ہو یا نہ ہو‘ اس طرح یہ لوگ نیکی کا دروازہ بند کر دیتے ہیں یا انسانوں کے درمیان اس کا دائرہ تنگ کر دیتے ہیں۔

ہماری زندگی میں اس قسم کے واقعات بار بار نظر آتے ہیں‘ ان پر غور کریں:

ایک آدمی دعوتی‘ معاشرتی یا خاندانی میدان میں اصلاح کا پروگرام لے کر اُٹھتا ہے اور اپنی ساری کوشش خرچ کر ڈالتا ہے اور مال بھی خرچ کرتا ہے۔ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دوسروں سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کام میں اس کی مدد کریں۔ لیکن کوئی اس کا مددگار نہیں بنتا اور وہ اکیلا ہی کام شروع کر دیتا ہے۔ وہ اکیلا ہی محنت کرتا ہے اور مسلسل کرتا چلا جاتا ہے‘ تاکہ اس کا پروگرام کامیاب ہو جائے اور ایک اچھا خوبصورت نتیجہ نکل آئے۔ لیکن جب اس پروگرام سے فائدہ اُٹھانے کا وقت آتا ہے اور اس کے کام میں کچھ کمیاں کمزوریاں نظر آنے لگتی ہیں —— اور ایسی کمزوریاں ہر انسان کے کام میں ہوا کرتی ہیں —— تو بجائے اس کے کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے اور اس کی محنت کو سراہا جائے اور ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کو حکمت کے ساتھ واضح کر دیا جائے‘ ہوتا یہ ہے کہ اس پر لعن طعن کی بارش کر دی جاتی ہے۔ حالانکہ اس شخص نے تعاون کے لیے دوسروں سے کہا تھا‘ لیکن کسی نے تعاون نہیں کیا‘ چنانچہ اس نے اکیلے ہی کام کو جاری رکھا‘ پھر جب پھل اُٹھانے کا وقت آیا تو اسے طعن و ملامت کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اس لیے کہ اس شخص کے پاس وسائل تھوڑے تھے اور اپنی طاقت بھی کم تھی۔ کیا یہ شخص اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا حق دار نہیں بنتا: ﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ﴾ (التوبۃ: ۹۱) ’’احسان کی روش اختیار کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں۔‘‘

اس طرح کی مثالیں دوسری جگہ بھی پیش آتی رہتی ہیں‘ مثلاً گھر میں‘ اسکول میں‘ تجارتی ادارے میں‘ بڑی کمپنی میں‘ سرکاری دفتر میں‘ یا کسی نشر و اشاعت کے ادارے میں۔ یہ صورتِ حال علماء‘ واعظوں‘ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کام کرنے والوں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی پیش آ سکتی ہے۔ ہمیں اس اصول کو سمجھنے کی شدید ضرورت ہے اور نیکی کا کام کرنے والوں کی غلطیوں کے ساتھ کس طرح نمٹنا چاہیے اس کو سیکھنے کی بھی ضرورت ہے‘ تاکہ نیکی کا دروازہ بند نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ اگر نیکی کرنے والوں اور مفت خدمت کرنے والوں پر مسلسل طعن و ملامت ہوتی رہی اور جن سے کچھ کر گزرنے کی اُمید تھی وہ دل توڑ کر بیٹھ گئے تو اُمت کے اجتماعی و فلاحی کام کون کرے گا؟

اس حقیقت کے باوجود جہاں توجہ دلانے کی ضرورت ہو وہاں غلطی پر توجہ دلانے یا صحیح بات پر توجہ دلانے سے غافل نہیں رہا جا سکتا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ توجہ دلانے کا اسلوب ایسا ہو کہ نیکی کرنے والے کی محنت محفوظ رہے اور غلطی پر توجہ بھی ہو جائے‘ تاکہ کام میں ترقی ہوتی رہے اور کام کے معیار اور خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوتا رہے۔

ہم اس اُصولِ قرآن کی بات کر رہے ہیں تو اس میں یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ جو اصول بیان ہو چکا ہے (کہ نیکی کرنے والے کی ناقدری نہ ہو) اور اس بات کو گڈمڈ نہ کر دیا جائے کہ جب کوئی آدمی ذمہ داری قبول کر لے تو پھر وہ اس حجت کے ساتھ اس کام کو درمیان میں چھوڑ دے کہ وہ تو محض نیکی کے جذبے کے ساتھ یہ کام کر رہا تھا۔ یہ بات اس قرآنی قاعدے کی غلط تعبیر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دوسرے کے ساتھ وعدہ کرنے سے پہلے پہلے وہ آدمی نیکی اور احسان کے دائرہ کار میں تھا‘ لیکن جب اس نے کسی کام کو کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی تو اب وہ فرض و واجب کے حدود میں چلا گیا ہے۔ اب کوتاہی کی صورت میں اس کا حساب بھی ہو سکتا ہے اور سزا بھی مل سکتی ہے۔ میں نے اس بات کی طرف اس لیے توجہ دلائی ہے کہ بہت سارے لوگ اس اصول کو غلط سمجھے ہیں اور اس کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ نتیجتاً اس نے باہمی نفرت کو جنم دیا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک فریق سمجھ لیتا ہے کہ دوسرے آدمی نے ذمہ داری قبول کر لی ہے اور پہلا فریق اللہ تعالیٰ کے بعد دوسرے فریق پر اعتماد کر بیٹھتا ہے‘ جب کہ دوسرا فریق راستے میں ذمہ داری کو اس حجت کے ساتھ چھوڑ دیتا ہے کہ وہ تو بس نیکی کمانے والا تھا۔ نیکی اور احسان تو دور کی بات ہے‘ سارا معاملہ اُلٹ ہو جاتا ہے۔ (جاری ہے)

کیا ابلیس فرشتوں میں سے تھا؟

پروفیسر خورشید عالم

ہمارے دور کے بعض علماءِ کرام اور خطباء کی سہل پسندی بسا اوقات ناگوار صورتحال پیدا کر دیتی ہے۔ منبرِ رسول ﷺ پر بیٹھ کر مستند اور ٹھوس بات کہنا اس بات کا متقاضی ہے کہ خطیب حضرات پہلے خطبہ وتقریر کی مناسب تیاری کا اہتمام کریں اور روایات میں سے رطب ویابس کو ضروری تحقیق کے مراحل سے گزاریں... تاکہ عوام الناس کو صحیح پیغام مل سکے اور وہ ذہنی خلجان سے محفوظ رہ سکیں۔

کچھ ایسی ہی صورتحال پچھلے دنوں ہمارے محلے کی مسجد کے محترم خطیب صاحب کے خطابِ جمعہ سے پیدا ہوئی۔ موصوف نے دورانِ خطابِ جمعہ ارشاد فرمایا کہ شیطان (ابلیس) فرشتوں کا استاد تھا...! یہ بات بادیٔ النظر میں خلافِ حقیقت محسوس ہوئی تو نجی ملاقات میں راقم نے اس کی تردید میں قرآن کریم کی دو آیاتِ کریمہ پیش کیں:

(۱) ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الکھف: ۵۰)

''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنات سے تھا اس لیے اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہو گیا۔''

(۲) ﴿قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ⑫﴾ (الاعراف)

''اُس نے کہا: میں اس سے افضل ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا۔''

یہ دونوں آیات اس بات میں نصِ قطعی کا درجہ رکھتی ہیں کہ شیطان فرشتہ نہ تھا... کہ وہ فرشتوں کا استاد مقرر کیا جاتا... بلکہ جن تھا۔

ہمارے اس اشکال کے رد میں خطیب صاحب نے تین آثار پیش کیے، جو ذیل میں

درج ہیں:

(۱) قتادہ سے منقول ہے کہ حضرت سعید بن مسیبؒ نے کہا: ''ابلیس سمائے دنیا کے ملائکہ کا سردار تھا''۔ (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

(۲) ثعلبی نے جناب ابن عباسؓ سے یوں حکایت کی ہے: ''ابلیس فرشتوں کی ایک جماعت سے تھا جسے جن کہا جاتا تھا۔ جو نارِ سموم سے تخلیق کیے گئے، اور فرشتے نور سے پیدا ہوئے۔ عبرانی میں اُس کا نام ''عزازیل'' تھا اور عربی میں ''حارث'' اور ابلیس جنت کے پہریداروں میں شامل تھا اور سمائے دنیا کے فرشتوں کا سردار تھا، جسے سمائے دنیا اور زمین کی حکمرانی دی گئی تھی۔ اور وہ ان فرشتوں میں شامل تھا جو علم اور عبادت میں کثرت کرتے تھے''۔ (بحوالہ قرطبی)

(۳) ابن المنذر نے بھی حضرت ابن عباسؓ روایت کیا ہے کہ ''ابلیس باعزت فرشتوں میں سے تھا اور قبیلے کے اعتبار سے بھی بڑا تھا''۔ (بحوالہ الدرّ المنثور للسیوطی)

دورانِ مطالعہ راقم کے علم میں آیا کہ ان (اور ان جیسے بہت سے) آثار میں ابلیس کو فرشتہ قرار دینے کے لیے عجیب کہانیاں بنائی گئی ہیں۔ چنانچہ کوئی جنوں کو فرشتوں کا قبیلہ قرار دیتا ہے۔ کوئی اسے اَشرافِ ملائکہ میں قرار دے کر اسے فرشتوں کا معلّم بتاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جنوں اور فرشتوں کی جنگ ہوا کرتی تھی، چھٹپنے میں قید ہو کر وہ فرشتوں میں آ گیا اور ملائکہ کی طرح عبادت کرنے لگا، اس لیے ملائکہ میں سے سمجھا جانے لگا۔ کوئی کہتا ہے کہ ابلیس بھی جن ہے اور فرشتے بھی جن ہیں، کیونکہ دونوں دکھائی نہیں دیتے۔ کوئی کہتا ہے ابلیس جنت کا داروغہ تھا، اس لیے اسے ''جان'' کہا گیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ کاش وہ ان آثار پر بھی نظر ڈال لیتے جن میں اُن کے بیان کردہ آثار کی پرزور مخالفت کی گئی ہے۔

متذکرہ بالا آثار کے علاوہ محترم خطیب صاحب نے میری کم علمی کے علاج کے لیے اور اِتمامِ حجت کے طور پر شہر کے سب سے معروف دارالعلوم کے دارالافتاء سے ایک فتویٰ بھی حاصل کیا جسے ''الجواب صحیح'' کی سند بھی عطا کی گئی ہے۔ فتویٰ کی عبارت یوں ہے:

> ''مسئولہ صورت میں بشرطِ صحتِ بیان آپ کی ساری معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ شیطان جن تھا فرشتہ نہ تھا۔ اور ہم نے جو معروضات پیش کی تھیں اُن کا خلاصہ یہ تھا کہ شیطان فرشتوں کا اُستاد تھا یا رئیس الملائکہ تھا۔ ہم نے کہیں نہیں کہا کہ شیطان فرشتہ تھا۔

اور بادیٔ النظر میں دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اس لیے کہ یہ عام واقعہ ہے کہ جنات انسانوں کے پاس تعلیم کے لیے آتے ہیں۔ ایسے ہی فرشتوں کا ابلیس سے' اُس کے راندۂ درگاہ ہونے سے پہلے کچھ پڑھنا' یا کچھ فرشتوں کا اُس کے تابع ہونا ممکن ہے۔ لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ فقط واللہ اعلم۔''

راقم کے ذوقِ تجسّس کی مہمیز کے لیے یہ قیمتی مواد کافی تھا' چناں چہ اسے معاملہ کی تحقیق کے لیے بعض جدید وقدیم امہاتِ تفسیر کی جانب مراجعت کا موقع نصیب ہوگیا۔ ذیل میں اس مطالعے کے چنیدہ نکات اور حوالہ جات قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیے جارہے ہیں۔

بیان القرآن (۹:۲۶۰) میں ہے:

قال ثنا ابن عدی عن عوف عن الحسن قال: ماکان ابلیس من الملائکة طرفة عین قطّ وانه اصل الجن کما ان آدمؑ اصل الانس۔

''حسن نے کہا کہ ابلیس پلک جھپکنے کی مدت تک بھی ملائکہ میں سے نہ تھا' وہ جنّات کا اسی طرح باپ ہے جیسے آدم انسانوں کے باپ ہیں۔''

قاتل اللّٰہ اقواما زعموا انّ ابلیس من الملائکة واللّٰہ تعالیٰ یقول: کان من الجن وما کان ابلیس من الملائکة طرفة عین۔ (روح المعانی ۸:۲۹۳)

''حسن نے یہ بھی کہا ہے: خدا ان لوگوں کو ہلاک کرے جو کہتے ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا' حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابلیس جنّات میں سے تھا۔''

بیان القرآن (۱:۲۲۶) میں ہے:

حدثنا یونس عن ابن وھب قال ابن زید ابلیس ابوالجن کما آدم ابوالانس، وعلّة من قال ھذہ المقالة ان اللّٰہ جل ثناء ہ أخبر فی کتابه انّه خلق ابلیس من نار سموم ومن مارج من نار ولم یخبر عن الملائکة انه خلقوا من شیء من ذلك، وان اللّٰہ جل ثناء ہ اخبر انه من الجن، فقالوا غیر جائز ان ینسب الی غیر ما نسبه اللّٰہ وقالوا لا بلیس ذریة ونسل والملائکة لا تتوالد ولا تتناسل۔

''ابن زید کا قول ہے کہ ابلیس اسی طرح جنّوں کا باپ تھا جس طرح آدم انسانوں کے باپ تھے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ اس نے ابلیس کو بے دھوئیں کی آگ سے اور آگ کے شعلے سے پیدا کیا اور اللہ عزوجل نے بتایا کہ وہ جنات سے تھا۔ علماء کا قول ہے کہ کسی چیز کو اللہ کی بیان کی گئی نسبت کے سوا منسوب کرنا جائز نہیں۔ ان کا

قول ہے کہ ابلیس کی اولاد اور نسل ہے جبکہ فرشتوں کی نہ اولاد ہے نہ نسل۔''

اب آتے ہیں قرآنی آیات کی تفسیر کی طرف۔

سورۃ الکہف کی آیت ۵۰ کی تفسیر میں تفسیر کشاف قولِ فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔ زمخشری فرماتے ہیں:

﴿کَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ کلام مستانف جاری مجری التعلیل بعد استثناء ابلیس من الساجدین کأنّ قائلا قال ماله لم یسجد؟ فقیل ﴿کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ قال: جعل کونه من الجن سببا فی فسقه لانه لو کان ملکا کسائر من سجد لآدم لم یفسق عن امر ربه لان الملائکة معصومون البتّة لا یجوز علیهم ما یجوز علی الجن والانس کما قال اللّٰہ: ﴿لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَھُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ﴾ (۲۱:۲۷) وھذا الکلام المعترض من اللّٰہ تعالیٰ لصیانة الملائکة عن وقوع شبهة فی عصمتهم/ وما أبعد البون بین ما تعمد اللّٰہ وبین قول قتادة وزعم أنه کان ملکا و رئیسا علی الملائکة فعصی فلعن و مسخ شیطانا ثم وبّخه علی ابن عباس

''﴿کَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ جملہ مستانفہ ہے جو ساجدین سے ابلیس کے استثناء کی علت بیان کررہا ہے۔ گویا پوچھنے والا پوچھتا ہے کیا بات ہے ابلیس نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو اسے جواب دیا جارہا ہے کیونکہ وہ جنّات میں سے تھا اس لیے وہ اللہ کے حکم سے باہر ہو گیا۔ گویا اس کا جن ہونا اس نافرمانی کا سبب ہے۔ اگر وہ ان فرشتوں کی طرح ہوتا جنہوں نے آدم کو سجدہ کیا تھا تو وہ نافرمانی نہ کرتا' کیونکہ فرشتے معصوم ہیں' ان کے لیے وہ جائز نہیں جو جن وانس کے لیے جائز ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وہ اللہ کے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے اور اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں''۔ (۲۱:۲۷) یہ جملہ معترضہ ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ فرشتوں کی عصمت میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو۔ کس قدر فاصلہ اللہ کے ارادے اور قتادہ کے ارادے میں ہے جو سمجھتا ہے کہ ابلیس فرشتہ بلکہ فرشتوں کا سردار تھا۔ اُس نے نافرمانی کی' وہ ملعون ہوا اور اسے شیطان کی صورت میں مسخ کردیا گیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس قول کا الزام ابن عباسؓ پر دھر دیا۔''

زمخشری کے نزدیک اس قول کو ابن عباسؓ کی طرف منسوب کرنا بہتان ہے۔

البحر المحیط (۶:۱۳۹) میں زمخشری کے قول کا حوالہ دینے کے بعد کہا گیا ہے کہ آیت سے

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا' وہ جنات میں سے تھا۔ یہی بات بیضاوی نے بھی کہی ہے۔(۱۲:۴)

روح المعانی (۲۹۲:۸) میں بھی زمخشری کے قول کا حوالہ دیا گیا ہے اور ابن زید کے اثر کا بھی۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابلیس سے پہلے کوئی جن نہ تھا جیسے آدم سے پہلے کوئی انسان نہ تھا۔

تفسیر کبیر (۱۳۶:۲۱) میں امام رازی فرماتے ہیں: جو چیز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ فرشتوں میں سے نہ تھا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کی اولاد اور نسل ثابت کی ہے۔ اس بات سے لازم آتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا۔

کتاب التسہیل میں ہے: ''ظاہری طور پر اس مقام کا تقاضا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا اور اس کا استثناء' استثناء منقطع ہے' جس میں مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ ایک جنس سے نہیں ہوتے۔

مفردات امام راغب اصفہانی میں شطن کے مادہ کے تحت دو آیات (۱۵:۲۷ اور ۱۵:۵۵) کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ شیطان میں قوت غضب اور مذموم حمیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس بناء پر اس نے آدم کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔

تفہیم القرآن (۶۲:۱) میں مولانا مودودی فرماتے ہیں: کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ وہ فرشتوں میں سے تھا۔ وہ جنوں میں سے تھا جو فرشتوں سے الگ مخلوقات کی ایک مستقل صنف ہے۔

خلاصہ

قرآن مجید نے مکلّف مخلوقات کی حیثیت سے تین مخلوقات کا ذکر کیا ہے: فرشتے' جنّات اور بشر۔ جنوں (اور انسانوں) میں سے جو لوگ خدا کی نافرمانی پر مصر رہتے ہیں وہ لوگ ابلیس کی ذرّیت (اور اس کے اولیاء) میں شامل قرار پاتے ہیں۔ ملائکہ کے متعلق قرآن نے ہر مقام پر کہا ہے: ﴿هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۴۹:۱۶)۔ نیز قرآن حکیم کے کئی ایک مقامات پر فرشتوں کو خدا کا لشکر کہا گیا ہے۔ وہ براہِ راست اللہ سے حکم پاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اُن کو کسی استاد کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُن کا کوئی استاد ہوتا تو وہ بھی اُن کی طرح نوری مخلوق ہوتا۔ جبریل امین علیہ السلام سے بڑھ کر اس کام کے لیے کون موزوں تھا؟ ابلیس ملائکہ میں سے کیسے ہوسکتا ہے جس کا صنفی تعارف ہی یہ کرایا گیا ہے: ﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ﴾ (۳۴:۲) اور

بارہا اسے دہرایا گیا ہے۔ یہ قول کہ فرشتوں کا ابلیس سے کچھ پڑھنا یا کچھ فرشتوں کا اس کے تابع ہونا ممکن ہے' بھی اسی طرح کا ایک غیر معقول اور بے وقعت قول ہے جس طرح ابلیس کا فرشتوں میں سے ہونا بالکل غیر معقول بات ہے' جس پر اصرار مناسب نہیں ہے۔ ناری مخلوق جس کی فطرت میں نافرمانی اور کفر ہے' کو فرشتوں کا اُستاد بنانا' معاذ اللہ' اللہ کے علیم وخبیر ہونے پر حرف گیری کے مترادف ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کوئی صحیح' مرفوع یا حسن درجے کی روایت اس امر پر دال نہیں ہے۔ جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ بطور استشہاد انہی روایات کا حوالہ دیا گیا ہے جن کا سختی کے ساتھ ردائمہ محققین کر چکے ہیں۔

قال ابن كثير وقد روى فى هذا آثار كثيرة عن السلف وغالبها من الاسرائيليات ومنها ما قد يقطع بكذبه لمخالفة للحق الذى بايدينا وفى القرآن اخبار غنية كل ما عداه من الاخبار المتقدمة (۹۰:۳)

''حافظ ابن کثیر کا قول ہے کہ اس بارے میں سلف صالحین سے بہت سے آثار مروی ہیں' جو زیادہ تر اسرائیلی روایات ہیں۔ ان میں کچھ آثار قطعی طور پر جھوٹے ہیں کیونکہ اس حق کے مخالف ہیں جو ہمارے سامنے ہے۔ قرآن کی خبریں دوسری تمام خبروں سے بے نیاز ہیں جو پہلے گزر چکی ہیں۔'' ❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو' ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

''بیان القرآن''

آسمانِ تفاسیر کا درخشندہ ستارہ

نذر حیات خان ☆

قرآن کریم کے نزول سے پہلے تہذیب وتمدن کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ اخلاق کی کھیتیاں اُجڑ چکی تھیں۔ انسانیت برسر بازار نیلام اور آدمیت رسوا ہو رہی تھی۔ انسان ملوکیتِ قیصر وکسریٰ کے جبر واستبداد تلے دبے آہیں اور سسکیاں بھر رہے تھے۔ بے کُو اور بے شعور عقیدتوں کی وجہ سے مذاہب کے نقوش دھندلا چکے تھے۔ گویا حماقت' جہالت' جاہلیت اور سفاکیت کا دور دورہ تھا۔ مرکز توحید تک میں انسانوں کے خود تراشیدہ بتوں کی پوجا ہو رہی تھی..... کہ کوہِ حرا سے نکل کر فاران کی چوٹیوں پر ایک صدائے دلنواز ابھری اور انسانیت کو ایسا نسخہ کیمیا دیا کہ جس نے مسِ خام کو کندن بنا دیا۔ اس نے سوچیں بدلیں' انداز بدلے' اطوار بدلے' کردار بدلے' اخلاق بدلے۔ گویا ارض بدلی' سماوات بدلے' کیونکہ یہی معدنِ حکمت' سرچشمۂ فیض' منبع ایمان پیغامِ الٰہی تھا۔

قرآن کریم کی اس اہمیت کے پیش نظر ہر دور میں اس کے علوم ومعارف اور پر از حکمت احکام وفرامین سے استفادہ کرنے والوں نے اس چشمۂ آبِ حیات کی طرف حیاتِ جاوداں کے لیے انسانوں کو بلانے کا احسن سلسلہ جاری کیا۔ اگر چہ دینِ اسلام کی امہاتِ کتب عربی زبان میں ہیں' لیکن اب اردو اور دوسری زبانیں بھی علومِ قرآنی سے مالا مال ہو رہی ہیں۔ جدید تفاسیر کے ساتھ ساتھ قدیم تفاسیر کے مستند رنگا رنگ تراجم سامنے آ رہے ہیں۔ تفسیرِ دُرِّ منثور' تفسیرِ قرطبی' امام رازی کی تفسیرِ کبیر' تفسیرِ مظہری' فیوض الرحمٰن' تفسیرِ خازن' تفسیرِ بغوی' تفسیرِ طبری' تفسیرِ ابن کثیر' تفسیرِ جلالین' تفسیرِ بیضاوی' تفسیرِ مدارک اور تفسیرِ ابن عباسؓ جیسی قدیم

☆ ہیڈ ماسٹر۔ محلّہ لویاں والا' خوشاب۔ موبائل: 03006075804

عربی تفاسیر کو خوش اسلوبی سے اردو میں ڈھال لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مفسرین نے اردو میں براہ راست اپنے اپنے ذوق کے مطابق تفاسیر کی کہکشاں سجائی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر ''بیان القرآن'' تو سب ہی تفاسیر کا منبع اور سرچشمہ بن گئی ہے۔ یہ بڑے علمی رموز ونکات کی جامع تفسیر ہے' لیکن عالمانہ انداز کی وجہ سے عام قاری اس سے کما حقہٗ استفادہ سے محروم رہتا ہے۔ اس کے حاشیے پر تصوف کے پیچیدہ مسائل و نظریات پر بڑی پُرمغز بحثیں ہیں۔ ان میں اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کے لیے ضروری مباحث ہیں' لیکن ان سے استفادہ بھی اسی میدان کے شناور اور بلند علمی ذوق رکھنے والے ہی کر سکتے ہیں اور اس سے فیض پا سکتے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی ''تفسیر عثمانی'' اگر چہ مختصر ہے لیکن بڑی جامع ہے۔ اس میں قرآن حکیم کے مدعا کو مختصر الفاظ میں سمو دیا گیا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی اساس پر حضرت شیخ الہندؒ نے اسے جدید قالب میں ڈھالا ہے اور اس پر مختصر حواشی زیادہ تر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ہیں۔ یہ ترجمہ وتفسیر بہت ساری تفاسیر سے بے نیاز کر دیتا ہے اور قرآن فہمی کے لیے کفایت کرتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی ''معارف القرآن'' میں ترجمہ شیخ الہندؒ کا ہے اور اس پر علمی نکات ''بیان القرآن'' سے ہیں۔ پھر ان پر معارف ونکات اور قرآن کریم سے اخذ ہونے والے فقہی نکات حضرت مفتی صاحب مرحوم کے ہیں۔ گویا یہ بزرگانِ امت کی قرآنی محنت کا نچوڑ ہے اور احکامِ قرآنی اور فقہی مسائل کے حوالے سے جامع تفسیر ہے۔ اس کی زبان بھی عام فہم ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی ''معارف القرآن'' کلامی بحثوں سے مزین ہے۔ متکلّمانہ اندازِ تحریر نے اس تفسیر کو علماء اور علم الکلام سے دلچسپی رکھنے والوں تک محدود کر دیا ہے۔ قرآن کریم کے اعلیٰ درجۂ علم وحکمت کو اس میں کلامی دلائل سے اجاگر کیا گیا ہے۔ قرآن کی محکمیت اور اسلام کے بنیادی عقائد توحید' رسالت اور آخرت پر بڑی پُرمغز دلائل سے مزین بحثوں نے اس تفسیر کو نمایاں درجہ دے دیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ''تفسیرِ ماجدی'' میں فلسفہ کا رنگ غالب ہے۔ اس میں دہریت کا ردّ بھی ہے اور مذاہبِ عالم کے حوالے سے اسلام کے ایک چیلنج ہونے کا اظہار بھی ہے۔ کچھ

مقامات پر تفردات ہیں، مگر بحیثیت مجموعی امت کے اجتماعی دھارے سے ہم آہنگ ہے۔

حضرت پیر محمد کرم شاہؒ کی تفسیر ''ضیاء القرآن'' اردو ادب کا سرمایۂ افتخار ہے۔ پُرکیف اور دلنشیں تحریر کی حامل ہے۔ اس میں تحقیق کی جستجو بھی ہے اور یہ کوثر و تسنیم سے دھلی زبان میں قرآن کی ادبی و علمی بلاغت کی شاہکار تفسیر ہے۔ صوفیانہ رنگ بھی اکثر مقامات پر جھلکتا ہے۔ اختلافی مسائل میں اعتدال و توازن کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

مولانا مودودیؒ کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' ایک نئی قسم کے سلوکِ قرآنی کی حامل ہے، جس میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم کی بجائے میدانِ عمل میں انقلاب پرابھارا گیا ہے۔ انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ بحیثیت مجموعی امت کے احیاء کی تمنا اس کے مطالعہ سے جنم لیتی ہے۔ تہذیبِ مغرب کے تیشہ زن نے اس تہذیب کے کھوکھلے پن کو بھی اس میں اجاگر کیا ہے۔ مذاہب کا تقابلی جائزہ بھی بھرپور ہے۔ صہیونیت اور نصرانیت کے عزائم بھی سامنے آتے ہیں۔ یہ تفسیر تحریک اسلامی کے لیے واقعتاً تحرک کا ذریعہ ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی ''تدبرِ قرآن'' انسانی تدبر و تفکّر کا شاہکار ہے۔ عربی زبان کا طُرّۂ امتیاز اس کی مخصوص فصاحت و بلاغت ہے جو فکر فراہی و فکر اصلاحی کے اس شاہکار سے سامنے آتی ہے۔ اس میں ربطِ سور و آیات کو اس طرح سامنے لایا گیا اور اس طرح گروپ بندی کی گئی ہے کہ پوری کتابِ الٰہی ایک مربوط اور مسلسل تقریر معلوم ہوتی ہے۔ اصلاحی صاحب کے تفردات اور امت کے مجموعی رجحان سے گریز کا الزام اس تفسیر کی افادیت کے راستے میں رکاوٹ کا باعث بنے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی یہ تفسیر ''سبیل المؤمنین'' ہی پر گامزن کرنے والی ہے۔

حضرت مولانا غلام اللہؒ کی تفسیر ''جواہر القرآن'' علمی مگر تھوڑی ثقیل زبان کی حامل ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے، اپنی ساری تگ و تاز اور ساری قلمی صلاحیتوں کو نقطہ توحید پر مرکوز کرتی ہے کہ توحید ہی اصل دین ہے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی تفسیر ثنائی، مولانا عبدالرحمٰن کیلانی کی تیسیر القرآن، حافظ صلاح الدین یوسف کی تفسیر احسن البیان، علامہ غلام رسول سعیدی کی تبیان القرآن اور دیگر بے شمار تفاسیر و تراجم اپنی مخصوص خصوصیات کی بدولت اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مقبولیت رکھتے ہیں۔ اردو زبان کے قاری کو اب کوئی شکوہ نہیں رہنا چاہیے کہ اس کے لیے قرآن کی تفہیم و تبیین مشکل ہے۔ ان تفاسیر نے یہ مشکل آسان کر دی ہے اور ہر شخص اپنے اپنے مزاج کے مطابق

اور اپنے ذوق کی تسکین کے لیے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اپنے لیے قرآن سے ہدایت کا سامان لے سکتا ہے۔ کیونکہ یہ سبھی سرچشمہ ہدایت سے پھوٹتے ہوئے سوتے ہیں۔

تفسیر کے اس بحرِ بے کنار میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تفسیر ''بیان القرآن'' ایک زوردار موج کی صورت ابھری ہے جس نے عوام کی کثیر تعداد کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ کئی کئی ایڈیشنوں پر مشتمل اس کی مختلف جلدوں کی برق رفتار اشاعت اس امر کی دلیل ہے کہ اس نے مقبولیت اور علمی حلقوں میں پذیرائی کی دوڑ میں مختصر وقت میں نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس تفسیر میں سور و آیات کا ربط جلی و خفی بھی ہے، انسانی تدبر و تفکر بھی ہے، مگر ساتھ تحریر کی سادگی اور روانی بھی ہے۔ ضرورت کے مطابق ضروری احکام و مسائل بھی ہیں۔ فلسفہ و حکمت کی بھی کہیں کہیں جھلک ہے۔ تصوف و سلوک کے طریقوں اور وظیفوں کی بجائے اس کے مقاصدِ جلیلہ کی راہنمائی بھی ہے۔ تزکیۂ نفس کا سامان بھی ہے۔ جماعتی نظم کی اہمیت بھی سامنے آتی ہے۔ گویا جامعیت میں یہ اپنی مثال آپ بن گئی ہے۔ یہ تفسیر اس اعتبار سے بھی یکتا ہے کہ یہ محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی تحریر نہیں ہے، بلکہ ڈاکٹر صاحبؒ کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن کو دو باصلاحیت فاضل مرتبین نے تحریر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

اس تفسیر دلپذیر کے علمی و ادبی اور تحریکی محاسن کو دلائل اور مثالوں سے سامنے لایا جا سکتا ہے۔ طوالت کے خوف سے یہ کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ ہر متلاشی حق کے لیے صلائے عام ہے کہ اس کا مطالعہ کر کے خود ان خوبیوں کا مشاہدہ کرے۔

قرآن کریم بنیادی طور پر ایک کتابِ ہدایت ہے جو قافلہ انسانیت کو اعتدال و توازن کے ساتھ صراطِ مستقیم پر گامزن کر کے اسے اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی ضامن ہے۔ منفعتِ انسانی کے لیے جتنے علوم ہیں ان سب کی بنیاد ہی کتابِ مبارک ہے۔ یہ تمام صحائف انبیاء اور کتبِ آسمانی کی تعلیمات کی محافظ اور مہیمن ہے۔ ''بیان القرآن'' کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس ہدایت کو سامنے لاتی ہے جو قرآن کریم کا مقصود ہے۔ اختصار کے ساتھ روانی کی حامل الجھاؤ سے پاک تحریر منزل کی نشان دہی کرنے والی ہے۔ فرقہ وارانہ اور اختلافی بحثوں سے اس کے دامن کو بچایا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ اتحادِ امت کی نقیب بن گئی ہے۔ دورِ حاضر کے سلگتے مسائل پر بڑے احسن انداز اور معتدل طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ ان مسائل کی صدیوں سے الجھی گتھیاں کھلتی محسوس ہوتی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کے مطابق فتنوں کے زمانے میں امت کی نجات تمسک بالقرآن سے ہوسکتی ہے۔ قرآن کریم نے قرنِ اول میں امت مسلمہ کو عروج بخشا تھا اور زمانے کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ وسعتِ افلاک میں اس کی تکبیر مسلسل کے لاہوتی نغمے وجہ نشاطِ گوش بنتے گئے۔ یہی آزمودہ نسخہ کیمیا ہر زمانے میں قوموں کی امامت کرسکتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے دعوت رجوع الی القرآن کا نعرۂ حیات افروز بلند کیا اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ اس دعوت کی نذر کر دیا۔ یقین محکم، اٹل ایمان، خلوصِ نیت کے جذبے سے اس دعوت کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ ''بیان القرآن'' اس دعوت کی نمائندہ ہے۔ اس کی سطر سطر قاری کو اس عظیم الشان دعوت کی طرف بلاتی نظر آتی ہے۔ وہ تمام مقامات جہاں جہاں اس جہادِ عظیم کا بیان ہے وہاں ڈاکٹر صاحب کا جوش وجذبہ اور جولانی طبع قابلِ دید ہے۔

قرآن کریم کی دعوت پوجا پاٹ کی دعوت نہیں اور نہ ہی یہ ترکِ دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ اس سے رہبانیت نہیں، ربانیت کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ دنیا کی فلاح اور اخروی نجات کے لیے جماعتی نظم کو ضروری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ یہ تفسیر ایک ایسے نظام کے قیام کی داعی ہے جس میں عدل، حریت، مساوات، اخوت اور رواداری جیسی اعلیٰ اقدار کا راج ہو اور انسانیت کا قافلہ سکون اور اطمینان کے ساتھ سوئے منزل شاہراہ ارتقاء پر گامزن ہو۔ منزل یہ نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوت ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے پہلے رجوع الی القرآن کی دعوت کو عام کیا۔ پھر تنظیم اسلامی کے نام سے ایسا قافلہ ترتیب دیا اور ایسا نظم اجتماعی قائم فرمایا جس کی اساس بیعت کے مسنون طریقے پر رکھی اور جس کی منزل نظامِ خلافت کا قیام قرار دیا۔

تفسیر بیان القرآن میں اسی مقصدِ جلیلہ کی طرف کما حقہ راہنمائی ملتی ہے۔ یہ تفسیر نظامِ خلافت کی طرف پکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر میں یہ پہلی دعوت نہیں بلکہ اس سے پہلے ''الہلال'' اور ''ترجمان القرآن'' اس دعوت کے نقیب تھے، لیکن امت مسلمہ کی بدقسمتی کہ زمانے کی گرم وسرد ہواؤں سے متاثر ہو کر اور نظریہ ہائے ضرورت کے اسیر ہو کر عاجلانہ اقدامات کی وجہ سے یہ عظیم الشان دعوت اپنی سمت تبدیل کر بیٹھی۔ لیکن یہاں حوصلہ کی داد دینی پڑتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جو بھی حالات ہوئے اپنی نگاہوں میں منزل کو سامنے رکھا اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن رہے کہ وہ جانتے تھے کہ نصب العین بدلنے سے منزلیں نہیں ملتیں بلکہ راستے تبدیل ہو جانے سے منزل اور دور ہوتی ہے۔

علامہ اقبالؒ امت مسلمہ کی بیداری اور اس کی شیرازہ بندی کے داعی تھے۔ ان کے فکر کا عروۃ الوثقیٰ اور مرکز ومحور قرآن کریم ہی تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد علامہ اقبال کو اس دور میں قرآن کریم کا عظیم ترجمان قرار دیتے تھے۔ تفسیر میں مدعا کی وضاحت اور زور بیان کے لیے ان کے کلام کو بھی کہیں کہیں پیش کیا ہے۔ قرآن کریم کی الٰہیاتی تعلیم کے مطابق منزل من اللہ حقائق کا فہم ہی اصل تعقل وتدبر، تفکر وتذکر اور علم وفہم کے در کھولتا ہے۔ وحی الٰہی کا مقصدِ تنزیل ہی یہ ہے کہ لوگ تعقل وتفکر کریں، حقائق ومعارف کا وہ گہرا شعور حاصل کریں جو دین ودنیا کے مسائل کو حل کرے۔

''بیان القرآن'' تدبر وتفکر کے ذریعے گہرا شعور بیدار کرتی ہے۔ جہاں جہاں عقل و شعور اور تدبر وتفکر کی اہمیت ہے وہاں ''بیان القرآن'' کا انداز دیکھ کر خود کو انسان ہونے اور صاحبِ ادراک ہونے پر فخر محسوس ہونے لگتا ہے۔

''بیان القرآن'' میں علمیات، اخلاقیات، معاشیات اور معاشرے پر قرآن کریم کی تعلیمات کے اثرات کو حکیمانہ اور بصیرت افروز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ الحاد وزندقہ کے حامل نظریات پر چشم کشا تبصرے بھی ہیں اور ایمان وتقویٰ پر قطعی وحتمی ایقان فراہم کر کے ذہنی وقلبی آسودگی عطا کرنے کا سامان بھی ہے۔ اور طُرّۂ امتیاز یہ کہ طویل مباحث کی بجائے انتہائی اختصار کے ساتھ مطالب قرآن کو سمو لیا گیا ہے۔ ''تذکر'' کی کیا مختصر سی تشریح ہے کہ قرآن کو اتنا سمجھنا کہ اس سے انسان نصیحت حاصل کر سکے! یہ آنکھ کے تل میں سماوات کی وسعتوں کو سمونے کا کمال ہنر ہے۔ اختصار کے ساتھ مطالب کو سمجھانا ان الفاظ کی کنہ وحقیقت اور ان کی اہمیت وحدود سے مکمل آگاہی کی وجہ سے ہے، ورنہ تعقل وتدبر کے پیمانے چھلک جائیں یا ظرف سے تجاوز کر جائیں تو انسان اپنے شعور وحدود سے ماورا ہو کر گمراہی کے راستے پر چل نکلتا ہے اور دوسری طرف تفکر وتذکر سے ترکِ دنیا کا مفہوم اخذ کر لیتا ہے۔ ''بیان القرآن'' میں ہر لفظ کو اس کی حدود میں حقیقی مفہوم تک ہی رکھا گیا ہے۔

یہ تفسیر ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ کی دعوت رجوع الی القرآن اور قیامِ نظامِ خلافت کے لیے کوشاں تنظیم اسلامی کے لیے سرمایۂ افتخار اور سرچشمہ وآلۂ انقلاب ہے۔ اللہ کریم امت کو اس سے استفادہ کی توفیق دے اور انہیں نظام خلافت کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلائے۔ جن مقاصد کے لیے یہ تفسیر لکھی گئی ہے اللہ ربّ العزت ان کو پورا کرے۔

❁❁❁

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء کے
قرآنی احوال اور مبشّرات

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر ☆

استاذ محترم‘ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے حال ہی میں فیس بک پر جناب قاری حنیف ڈار صاحب کی وال پر ایک نامناسب تحریر شائع ہوئی ہے‘ جس کا جواب دینے کی طرف کئی بھائیوں نے توجہ دلائی۔ اسی مناسبت سے اپنی ایک غیر مطبوع تحریر کو کچھ ایڈیٹنگ کے بعد فیس بک پر شیئر کیا اور اب کچھ مزید ایڈیٹنگ کے بعد ماہنامہ میثاق میں اشاعت کے لیے بھجوا رہا ہوں۔

اس تحریر میں فی الحال دو باتیں عرض کیے دیتا ہوں جو ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے والے ان کے رفقاء کو نصیب ہوئیں‘ ایک قرآنی احوال اور دوسرا مبشرات۔ یہ واضح رہے کہ جو باتیں میں یہاں بیان کر رہا ہوں‘ وہ میرے ذاتی مشاہدے‘ تجزیے اور خبر پر مبنی ہیں۔

پہلے قرآنی احوال کا کچھ تذکرہ ہو جائے۔ قرآن اکیڈمی میں تعلیم اور ملازمت کے تقریباً دس سال قیام کے دوران جب بھی ڈاکٹر صاحب سے ان کے آفس وغیرہ میں ملاقات ہوئی تو اس میں ایک خاص کیفیت حاصل ہوئی‘ یا صوفیاء کی اصطلاح میں ایک ’’حال‘‘ حاصل ہوا‘ جسے ’’سکینت‘‘ کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بہت غالب اور نمایاں حال ہوتا تھا جسے ان کا ہر رفیق محسوس کرتا تھا۔ گویا ان کی ذات سکینت کے نزول کا مرکز تھی اور ان کا رفیق ان کی صحبت میں اس سکینت اور اس کے نتیجے میں اپنے ایمان کی زیادتی کو اسی طرح محسوس کر سکتا تھا جیسا کہ برف کی سل کے پاس ٹھنڈک اور آگ کے الاؤ کے پاس حرارت کا احساس۔

ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے جتنے بھی احوال پیدا ہوتے تھے‘ وہ قرآنی احوال تھے۔ اور

☆ اسسٹنٹ پروفیسر‘ کامسائٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی‘ لاہور
ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk

الحمد للہ یہ ایسے احوال تھے کہ ان کے اللہ ہی کی طرف سے ہونے کی دلیل قرآن مجید اور سنت دونوں میں موجود ہے‘ جیسا کہ ایمان پر استقامت اور قرآن مجید کی تلاوت کی صورت میں فرشتوں کے نزول اور سکینت کے اترنے کا بیان قرآن مجید ﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ.....﴾ (فُصِّلَت: ۳۰) اور سنت ((نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ.....)) میں موجود ہے۔

ان کے بعض تلامذہ کا کہنا ہے کہ ذکر کا مزاج رکھنے والے متصوف بزرگ حضرات کی صحبت سے جو کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے اس کی نوعیت میں گہرائی ہے‘ جبکہ قرآن کا مزاج رکھنے والوں کی صحبت سے جو کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے وہ اپنی نوعیت میں گیرائی اور وسعت رکھتی ہے۔ پہلے مزاج کے حاملین کی صحبت سے قلب میں ’’خشوع‘‘ کی کیفیت عام طور پیدا ہوتی ہے اور صاحبِ حال کی صحبت سے دل میں حرکت محسوس ہوتی ہے‘ جیسے ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (الانفال: ۲) کی کیفیت‘ جبکہ دوسرے مزاج کے حاملین سے ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد: ۲۸) کی کیفیت حاصل ہوتی ہے‘ اور صاحبِ حال کی صحبت سے دل میں عجب اطمینان اور سکون اترتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کیا بعید ہے کہ پہلی آیت میں ذکر سے مراد ذکرِ الٰہی اور دوسری میں ذکر سے مراد قرآن مجید ہو‘ جیسا کہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ (الحجر: ۹) میں ہے۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعض رفقاء کا کہنا ہے کہ آج ہم میں سے اگر کوئی اس بات کا اہتمام کر لے کہ اپنے گھر میں ایک مخصوص جگہ‘ مثلاً کسی کمرے میں‘ مخصوص وقت‘ مثلاً مغرب تا عشاء کا وقت‘ محض قرآن مجید کی تلاوت کے لیے مختص کر لے کہ سب گھر والے جمع ہو کر تلاوت کریں اور اس میں ناغہ نہ کریں‘ اور اس کمرے میں کوئی لغو کام بھی نہ ہو‘ مثلاً بچوں کا کارٹون وغیرہ دیکھنا یا ویڈیو گیمز وغیرہ کھیلنا‘ اور نہ ہی تصاویر ہوں تو ایک ہی ہفتے کے بعد جو احوال اس مخصوص جگہ میں مخصوص اوقات میں تلاوت کرنے سے حاصل ہوں گے‘ وہی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حاصل ہوتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک قرآن مجید ہی تزکیہ کی واحد اور اکیلی بنیاد ہے۔ اور قرآن مجید سے تزکیے کا بہترین اور فوری طریقہ تہجد میں لمبے قیام میں قرآن مجید کو ترتیل کے ساتھ سمجھ کر پڑھنا ہے‘ جیسا کہ سورۃ المزمل میں ﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶﴾ کے الفاظ میں اس کا بیان ہے۔ تنظیم کے شروع دور کی قرآنی تربیت گاہوں کے ایسے واقعات بھی

منقول ہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں نے نوافل میں آٹھ راتوں میں قرآن مجید مکمل کیا۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ قیام بالقرآن کی بہت زیادہ ترغیب دیتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد کا کہنا ہے کہ ان کے دل میں ڈاکٹر صاحب کی ترغیب سے یہ عزم پیدا ہوا کہ لوگوں کو تو قرآن مجید سناتا ہوں' صاحبِ کلام کو بھی سنا دوں۔ تو اس غرض سے اکیڈمی کی مسجد میں روزانہ ایک پارہ تہجد کی نماز میں پڑھنا شروع کیا۔ اور سترہویں دن کے بعد ہی یہ کیفیت تھی کہ تہجد کے اشتیاق میں نیند اڑی جاتی تھی اور تہجد کے قیام میں کیفیت وہی ہوتی تھی جو سورۃ النور میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ .....﴾ (آیت ۳۵)

ڈاکٹر صاحب کے رفقاء میں یہ کثرت سے دیکھنے کو ملتا ہے کہ قرآن مجید سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسا کہ کسی مجسّم چیز سے محبت کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کا ادب' احترام' تعظیم' مصحف کو سینے سے لگانا' اسے چومنا' سفر وحضر میں اس کا پاکٹ سائز نسخہ اپنے ساتھ رکھنا' آزمائش اور پریشانی کے حالات اور اوقات میں اس کی تلاوت سے سکینت حاصل کرنا وغیرہ' یہ سب باتیں ان کی جماعت کے رفقاء میں عام ہیں۔ اور ان کے خواص کی کیفیت تو یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ زندہ رہنے والے لوگوں میں سے ہیں۔ ان کا جینا' مرنا' نماز اور قربانی' قرآن مجید بن چکا ہے۔

قرآن مجید سے تزکیہ کا حصول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے بعد ڈاکٹر صاحب کا خاصہ معلوم ہوتا ہے' واللہ اعلم۔ تصوف کا ابتدائی لٹریچر پڑھ لیں' مثلاً الرسالۃ القشیریہ' عوارف المعارف' التعرف' کشف المحجوب وغیرہ' یا متاخرینِ تصوف حضرت مجدد الف ثانی' حاجی امداد اللہ مہاجر مکی' حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہم اللہ وغیرہ کی کتب اور سوانح کا مطالعہ کر لیں' یا معاصر مربین مثلاً ڈاکٹر عبدالحی' مولانا اللہ یار خان صاحب' خواجہ شمس الدین عظیمی' مولانا ذوالفقار نقشبندی وغیرہم کے ملفوظات کو دیکھ لیں' امرِ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی دَور یا سلسلہ میں قرآن مجید سے احوال پیدا کرنے کو وہ مقام حاصل نہیں رہا' جو سماع' مثنوی یا مراقبہ وغیرہ جیسے ذرائع کو حاصل رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا نہ صرف یقین کامل حاصل تھا بلکہ اصرار بھی تھا کہ پروردگار کا اس طرح کا قرب کہ جو انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو حاصل تھا' اُسی کی ذات

سے صادر ہونے والے کلام کے علاوہ کسی اور چیز سے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور ان کا کمال یہ ہے کہ یہی یقین انہوں نے اپنے شاگردوں میں بھی پیدا کر دکھایا۔ قرآن مجید کے بارے اس یقین اور ایمان کے حصول میں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ اور ان کے قریبی رفقاء منفرد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیسویں صدی کی دینی شخصیات اور رہنماؤں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور علامہ اقبال رحمہما اللہ کو بہت زیادہ آئیڈیلائز کرتے تھے اور اس کی وجہ دونوں کا قرآن مجید سے تعلق بتلاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے رفقاء میں ایسے بھی ہیں کہ جن کا کہنا ہے کہ ہم قرآن ہی سے اپنا تزکیہ کریں گے' اصلاحِ نفس میں اسی کو اپنا شیخ بنائیں گے اور اسی سے جمیع احوال پیدا کریں گے۔ اگرچہ یہ احوال پیدا نہ بھی ہوں تو بھی ہم مجاہدہ کریں گے کہ ہم مجاہدے کے ہی مکلّف ہیں۔ اور اگر قرآن مجید سے ہمیں صحابہؓ والے احوال نصیب نہ ہوں گے تو ہم اپنے پروردگار کے سامنے روئیں گے' گڑگڑائیں گے کہ ہمیں اپنے کلام سے وہ احوال نصیب فرما کہ جو انبیاء اور صحابہ کو ہوئے۔ اور ایسے ہی رونے والے پیدا کریں گے جو اس بات پر ہی مصر ہوں گے کہ ان کے جمیع احوال قرآن ہی سے پیدا ہوں' یہاں تک کہ وہ اپنے پروردگار سے اسی حال میں جا ملیں اور کسی اور ذریعہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔

پس کلام اللہ سے اس والہانہ عقیدت اور محبت بھرے تعلق کے باوجود انہیں خواہ وہ احوال نصیب نہ بھی ہوں کہ جن کے تصوف کے حلقے دعوے دار ہیں تو بھی امید کی جا سکتی ہے کہ یہ قیامت کے دن اپنے مجاہدے اور اتباعِ سنت کے بدلے پروردگار سے زیادہ قریب ہوں گے۔ ایک صحیح حدیث کے مطابق قیامت والے دن امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو سابقہ اقوام کی نسبت کم محنت پر زیادہ اجر ملے گا۔ پس آخرت تو اللہ کی دین ہے کہ کسی کے کم مجاہدے پر اسے زیادہ اجر دے دے تو کون ہے جو اس کو پوچھ سکتا ہے؟ واللہ اعلم!

میرا تو یہی احساس ہے کہ اس باب میں یہ لوگ حق بجانب ہیں' کیونکہ ''احوال'' کا کیا ہے؟ وہ تو قوالی اور موسیقی سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور سماع اور رقص وسرود سے بھی انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ میر و غالب کی شاعری بھی احوال پیدا کر دیتی ہے اور المیہ وطربیہ سے بھی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات کسی فلم یا ڈرامہ میں کوئی سین دیکھنے سے بھی آہ و بکا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کوئی شک نہیں ہے کہ آہ و بکا اور دل کی نرمی بعض اوقات شیطان کی

طرف سے بھی طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن سے جو بھی حال پیدا ہوگا‘ وہ سچا ہوگا اور مستحب ہوگا۔ جبکہ بقیہ ذرائع سے جو احوال پیدا ہوتے ہیں‘ ان پر زیادہ سے زیادہ مباح احوال کا حکم لگ سکتا ہے‘ اور نیکی تو اس مباح حال کے نتیجے میں کیے جانے والے عمل پر ملے گی۔ جبکہ یہاں قرآنی احوال میں قرآن کا حال بذاتہ خود ہی ایک نیکی ہے‘ چاہے اس کے نتیجے میں کوئی نیکی عمل میں نہ بھی آئے۔

سماع‘ موسیقی‘ مراقبہ‘ شاعری اور المیہ سے کیفیات حاصل ہونے کے نتیجے میں وجد میں آنا یا آنسوؤں کا جاری ہونا فی نفسہ کوئی نیکی نہیں ہے‘ لیکن قرآن مجید کی تلاوت کے نتیجے میں آنسو جاری ہونا نیکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے رمضان کے مہینے میں کئی مرتبہ قرآن مجید براہ راست سننے کا اتفاق ہوا اور میں ان کے قریب ہی بیٹھتا تھا‘ اور عام طور پر محسوس کیا کہ قرآن مجید کے بیان میں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہوتی تھی۔

اسی طرح نماز میں کئی مرتبہ ان کے ساتھ یا پیچھے کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ میں نے انہیں نماز میں تلاوت قرآن مجید کی سماعت کے نتیجے میں وجد میں آ کر دائیں بائیں جھومتے نہ دیکھا ہو۔ وہ آگے پیچھے نہیں جھومتے تھے‘ جیسا کہ ہمارے ہاں حفظ کے طلبہ دورانِ حفظ آگے پیچھے ہوتے ہیں‘ اور اس کی ایک وجہ یہود کی مخالفت تھی کہ یہود تورات کی تلاوت کے وقت آگے پیچھے کی سمت میں جھومتے ہیں۔

ان کی سب سے بڑی کرامت یہی تھی کہ وہ فرائض اور مستحبات کا اہتمام اور محرمات اور شبہات سے اجتناب کرنے والے تھے اور اس میں خوب مجاہدے سے کام لینے والے تھے۔ قرآن اکیڈمی کے ہاسٹل میں قیام کے دوران کچھ عرصہ تک ان کے گھر سے مسجد کے درمیان میں میرا کمرہ پڑتا تھا‘ اگر کبھی صبح کی جماعت سے سوتا رہتا تو نماز باجماعت کے لیے جاتے ہوئے کھڑکی سے نظر ڈالتے اور ڈانٹ کر اٹھا دیتے۔ گھر‘ رہن سہن اور کھانے پینے میں بہت سادگی تھی‘ شاید آج کے زمانے کے کلرک کو بھی نصیب ہو۔ چٹنی سے روٹی شوق سے کھا لیا کرتے تھے۔

رہی مبشرات کی بات تو حدیث ((لَنْ یَبْقَ بَعْدِیْ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلاَّ الْمُبَشِّرَات)) کے مطابق مبشرات بھی کسی شخص کے بطورِ غالب صراطِ مستقیم پر ہونے کی دلیل ہیں۔ اور تنظیم کے رفقاء میں تنظیم میں شمولیت سے پہلے یا بعد میں ان مبشرات کا حصول عام ہے‘ لیکن رفقائے تنظیم

اس کے بیان کو پسند نہیں کرتے ہیں‘ بلکہ اکثر تو اسی میں شبہ کرتے رہتے ہیں کہ یہ مبشرات ہمارے بارے میں ہیں بھی یا نہیں؟ یا معلوم نہیں کہ ان کی حقیقت کیا ہو؟ وغیرہ۔ لیکن چونکہ بعض لوگ تعبیر وغیرہ کے لیے میری طرف رجوع کرتے ہیں کہ جس کا مجھے کچھ علم نہیں ہے‘ تو اس طرح کچھ معلومات مجھ تک پہنچ جاتی ہیں۔ عام طور پر رفقاء آپس میں ان کو شیئر نہیں کرتے‘ اور بعض نے تو یہ بھی کہا کہ صرف آپ ہی کو بتلایا ہے یا آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جن کو بتلا رہا ہوں‘ وغیرہ۔

تنظیم کے ایک سینئر رفیق نے ایک مرتبہ باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ انہیں بھی ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت ہوئی کہ گھوڑے پر تشریف لے جا رہے ہیں اور آپ ﷺ کے پیچھے چلنے والوں میں کچھ لوگ ہیں اور ان میں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ بھی ہیں۔ خواب کے بیان میں کوئی کمی بیشی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

اسی طرح حج کے موقع پر تنظیم کے کچھ رفقاء کے ساتھ ایک ہی کمرے میں تھے۔ ایک سینئر رفیق نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ مسجد نبوی میں وہ یعنی تنظیم کے چند رفقاء ایک ستون کے پاس بیٹھے تھے اور آپس میں قرآن سے تذکیر کر رہے تھے (یہ واضح رہے کہ مسجد نبوی میں متعین علماء کے علاوہ عوامی درس کی اجازت نہیں ہوتی‘ لیکن یہ ایک نجی حلقہ تھا) کہ ایک شخص آیا اور رفقاء کی مجلس میں بیٹھ گیا۔ تذکیر بالقرآن کے اختتام پر اس شخص نے رفقاء سے حال احوال پوچھا اور ان کے بارے میں کھوج کُرید کی۔ اور بعد میں بتلایا کہ اسے رات اللہ کے رسول ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی اور آپ ﷺ کو اُس نے مسجد نبوی میں اس ستون کے پاس بیٹھے دیکھا‘ اور اسی جگہ کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا کہ یہ رفقاء قرآن مجید سے تذکیر کر رہے تھے‘ لہٰذا وہ یہاں بیٹھ گیا۔ واقعے کے بیان میں کوئی کمی بیشی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

ایک اور رفیق تنظیم نے بتلایا کہ ابھی وہ تنظیم کے کچھ رفقاء کے زیر دعوت تھے اور تنظیم میں شامل نہیں ہوئے تھے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ تنظیم کے جو رفیق ان کو درسِ قرآن میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں‘ وہ ان کے ساتھ قرآن اکیڈمی کی مسجد میں ایک کونے میں موجود ہیں اور منبر کے پاس لوگوں کا رش ہے۔ انہوں نے خواب ہی میں اپنے دوست یعنی رفیق تنظیم سے پوچھا کہ منبر کے پاس رش کیوں ہے؟ رفیق تنظیم نے بتلایا کہ اللہ کے رسول ﷺ تشریف فرما ہیں‘ میں نے ملاقات کر لی ہے‘ تم بھی کر لو۔ یہ کہتے ہیں کہ میں جب ملاقات کے لیے گیا تو وہاں سے آپ ﷺ جا چکے تھے۔ اس کے بعد انہیں تنظیم میں شمولیت کے بعد ایک اور

خواب آیا کہ جس میں آپ ﷺ کی زیارت ہوئی۔ خواب کے بیان میں کمی بیشی کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

تنظیم کے ایک اور متحرک رفیق کا کہنا ہے انہیں تنظیم میں شمولیت کے بعد مختلف مواقع پر تین مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت ہوئی۔ اسی طرح ایک اور رفیق کا کہنا ہے کہ انہیں تنظیم میں شمولیت کے بعد اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی کہ جس کے نتیجے میں ایک دو دن تک ان پر مسلسل گریہ کی کیفیت طاری رہی کہ ہر وقت آنکھوں سے آنسو جاری رہتے تھے اور سینہ جیسے نور سے بھر دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ بھی تنظیم کے رفقاء نے مبشرات کا ذکر کیا ہے' لیکن بس اتنا ہی کافی ہے' ورنہ ہم بھی کہیں ''خوابوں والی سرکار'' نہ معروف ہو جائیں۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ اس قسم کی مبشرات صرف تنظیم ہی میں نہیں ہیں' اور تحریکوں اور جماعتوں میں بھی ہیں' مختلف مسالک کے علمائے حق میں بھی ہیں۔ اس قسم کی مبشرات ہرگز کسی کے جنتی ہونے کا ٹکٹ یا ضمانت نہیں ہیں' بلکہ ہمارے نزدیک ان کا مقصود صرف اتنا ہی ہے کہ اللہ عزوجل اپنے کمزور بندوں کے بارے میں یہ چاہتے ہیں کہ اس قسم کے مبشرات کے نتیجے میں وہ کسی ایسے جماعتی نظم یا اللہ کے مخلص بندوں سے وابستہ ہو جائیں کہ جن میں خیر کا پہلو غالب ہو اور اس وابستگی کے نتیجے میں دنیا و مافیہا کے فتنوں سے بچ جائیں۔

ان مبشرات کے بیان کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ اپنے معاصرین میں سب سے نیک یا ان کی تنظیم سب سے بہتر جماعت ہے۔ اس کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہی نیتوں' احوال اور اعمال کی بنیاد پر ہوگا۔ اس قسم کا خیال بھی استعاذہ (اللہ کی پناہ) کو واجب کر دیتا ہے۔ پس نعوذ بکلمات اللّٰہ التّامّات من غضبہ وعقابہ وشر عبادہ ومن ھمزات الشیاطین وان یحضرون۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

فطرت کے باغی

معاشرتی بگاڑ کا اصل سبب

رفیق چودھری

اسلام سلامتی والا دین اسی بنیاد پر ہے کہ خلافِ فطرت اور مضرِ انسانیت اشیاء وعوامل کے فوری تدارک کی ترغیب دیتا ہے اور ہر فتنہ کو بڑھنے سے قبل اس کے سدِباب کی تاکید کرتا ہے۔ ارتقاء، بہبود اور فلاح فطری انسانی تقاضا ہے اور اسلام قوانین فطرت کو لاگو کر کے معاشرے کو امن وسکون، فلاح و بہبود اور ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن کرتا ہے، حتیٰ کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کراتے ہوئے انسان کو اس کے فطری مقام اشرف المخلوقات پر فائز کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوشحالی وسلامتی اور ارتقاء انسانیت کی عظیم تر مثالیں، جن میں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ملتا اور اکیلی عورت ہزاروں میل تک سفر کرتی ہے سوائے مثالی اسلامی معاشرے کے کہیں اور نہیں ملتیں، محض اس لیے کہ اسلامی معاشرہ میں خلافِ فطرت عوامل وعناصر کے فوری قلع قمع کے قوانین عملاً نافذ تھے۔

تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ فطرت کے باغی اور سرکش عناصر ہی ہر ایک معاشرہ میں بگاڑ، فساد وشر، تخریب، اخلاقی انحطاط اور اجتماعی زوال کا اصل سبب اور بنیادی عنصر ثابت ہوئے ہیں اور جادوگر، جعلی پیر اور باطل کے پجاری عامل ہی وہ ناسور ہیں جو ایک معاشرہ کو فطری ارتقائی تقاضوں سے ہٹا کر غیر فطری ذرائع (ہتھکنڈوں) پر اُکساتے ہیں اور انسانیت کو معاشرتی و اخلاقی رفعتوں سے اُتار کر جرم، ناانصافی، تعصب، حق تلفی اور گمراہی کے ذلت آمیز راستوں پر لا ڈالتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مگر مختصر مثال یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ جب کوئی انسان فطرت کے تقاضوں اور معیّن اصولوں کے مطابق ترقی کی منازل طے کر کے آگے بڑھتا ہوا اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ کر دوسروں کے لیے مثال بن جاتا ہے تو اس کے یقیناً معاشرہ کے اوپر مثبت اور تعمیری اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ نہ کسی کی حق تلفی کا خدشہ، نہ شکایت، تلخی، عناد اور فساد وشر کا ڈر،

بلکہ کئی دوسرے لوگ پیروی میں اس جیسا یا اس سے بھی بہتر مقام حاصل کرنے کی خاطر محنت و مشقت کو اپنائیں تو لازماً معاشرہ امن وسکون کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔

اس کے برعکس جب کوئی شخص غیر فطری ذرائع مثلاً جعل سازی، لوٹ مار، کرپشن، جادوگری جیسے شیطانی ذرائع سے دوسروں کا راستہ روک کر آگے بڑھے گا تو ردعمل میں لازماً تلخی، عناد، فساد وشر بڑھے گا۔ قابل وذہین افراد کی حق تلفی ہوگی، نااہل و بدعنوان لوگ آگے آئیں گے، قومی تعمیر وترقی کا عمل رُک جائے گا، جاہل و بے دین طبقہ میں لوٹ مار، خیانت، بدعنوانی، بدکرداری، جعل سازی، حق تلفی، تعصب اور اجارہ داری کو حق سمجھا جائے گا، دین دار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ سنجیدہ حلقوں اور محبِّ وطن طبقہ میں محرومی و مایوسی (frustration) بڑھے گی۔ ان عوامل کی بدولت وسائل کی تقسیم میں عدمِ توازن سے طبقاتی خلیج بڑھتے بڑھتے بالآخر نوبت ذات پات اور اونچ نیچ تک جا پہنچے گی، تب احساسِ محرومی وعدمِ برداشت سے فساد پھیلے گا، بالادست طبقہ کی اجارہ داری کے ردعمل کے طور پر معاشرے میں عدل وانصاف، مساوات، بھائی چارہ اور اخلاقیات کا تیا پانچہ ہوگا اور جس کا نتیجہ بالآخر بدترین اخلاقی انحطاط اور اجتماعی زوال کے اور کچھ نہیں نکلے گا۔

تحقیق اور تجزیہ کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ ہر دور کی تاریخ میں جادوگر عامل اور ابلیس کے دیگر پیروکار ہی ہر ایک معاشرہ میں وہ بنیادی عنصر ثابت ہوئے ہیں جو تقدس کے پردے میں ان تمام برائیوں اور فتنہ وفساد کو معاشرتی سند عطا کرتے ہیں۔ قدیم مصری معاشرے میں جب یہ عنصر اپنے عروج پر پہنچا تو سرکشی، فساد اور کفر وشرک بھی عروج پر پہنچ گیا، یہاں تک کہ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کر ڈالا۔ دوسری طرف طبقاتی خلیج اس قدر بڑھ گئی کہ طاغوت کے بَل بوتے پر بالادستی حاصل کرنے والا طبقہ زیردست طبقہ کی نسل کشی پر اُتر آیا۔ اسی طرح بنی اسرائیل میں جب سامری جادوگر ابلیس کا پیروکار بن کر نمودار ہوا تو قوم موسیٰ علیہ السلام اور تورات کا انتظار بھی نہ کرسکی اور دیکھتے ہی دیکھتے کفر وشرک میں مبتلا ہوگئی۔ اللہ کے ہاں یہ عمل اس قدر ناگوار گزرا کہ اس کی نحوست سے پاک کرنے کے لیے بنی اسرائیل کو خود اپنے افراد کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہاں تک کہ باپ نے بیٹے کو، بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو قتل کیا اور گوسالہ پرستی کے شرک میں مبتلا ہونے والے ہزاروں اسرائیلی اس ایک دن میں قتل ہوئے، تب جا کر ان کو معافی ملی۔ اسی طرح ہندو معاشرہ میں ذات پات، اونچ نیچ اور طبقاتی خلیج

بھی اسی جادوگری کا کرشمہ ہے اور اسی وجہ سے حضور نبی اکرم ﷺ نے ہند اور دجال کے خلاف جہاد کی عظیم بشارت دی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حسرت کی کہ کاش وہ اس جہاد میں حصہ لے کر ان بشارتوں کے حق دار بن جائیں! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرت فوری طور پر فطرت کے باغیوں کے تدارک کا تقاضا کرتی ہے تاکہ انسانیت اس کے مضر اور مہلک اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کے ذریعے ان سرکشوں کے لیے فوری سزا کا حکم سنایا اور اسلامی نظام میں اس پر عمل کر کے بھی دکھایا گیا۔

☆ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جادوگر کی سزا یہ ہے کہ اسے تلوار سے قتل کر دیا جائے۔'' (ترمذی)

☆ بجالہ بن عبدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ ہر ایک جادوگر مرد و عورت کو قتل کر دو، تو ہم نے تین جادوگرنیوں کو قتل کیا۔ (بخاری)

☆ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر ان کی لونڈی نے جادو کر دیا تھا، ان کے حکم کے مطابق اس لونڈی کو قتل کر دیا گیا۔ (موطا امام مالک)

☆ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عمران بن حصین اور حضرت انس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے کبار صحابہ کرامؓ سے مستند کتب احادیث میں روایات موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی جادوگر، کاہن، نجومی یا علم غیب کا دعویٰ کرنے والے کے پاس جا کر اس کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق کرے، جادو کرے یا کرائے، فال نکالے یا نکلوائے، کہانت کرے یا کرائے تو حضور ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ کے مطابق اس نے دین محمدی ﷺ سے کفر کیا، اسلام سے خارج ہوا۔ نیز وہ آخرت میں بھی محروم رہا۔

☆ حتیٰ کہ قرآن مجید (البقرۃ:۱۰۲۔۱۰۳) میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ جادو سیکھنا نہ صرف کفر ہے بلکہ سراسر ایسا گھاٹے کا سودا ہے جس میں ماسوائے دنیا اور آخرت کے دائمی خسارے کے اور کچھ حاصل نہیں۔

انہی تعلیمات کی روشنی میں چاروں ائمہ کرام رحمہم اللہ نے بھی جادوگر کے فوری قتل کا فتویٰ دیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اہلِ کتاب یا ذمی (غیر مسلم) جادوگر کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کے علاوہ تینوں امام متفق ہیں کہ جادوگر کا قتل بوجہ حد کے ہے، لہٰذا اس کی توبہ سے اس پر سے حد نہیں ہٹے گی۔

اسلام کی یہ سنہری تعلیمات اور وضع کردہ قوانین فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق اور معاشرتی ارتقاء و بقاءِ انسانیت اور قومی تعمیر و ترقی کے ضامن بھی ہیں کہ جن کے نفاذ سے کسی بھی معاشرہ میں ایک ایسی مثالی طرزِ معاشرت تشکیل پا سکتی ہے جہاں ہر انسان کو بلا روک ٹوک و بے خوف و خطر ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی فطری آزادی ہوگی اور اس کی نجی زندگی میں ناجائز مداخلت کا ارتکاب ممکن نہ ہوگا۔ نتیجہ میں اعلیٰ اخلاقی و معاشرتی اقدار کو فروغ حاصل ہوگا اور معاشرہ امن و سکون و سلامتی، ترقی و خوشحالی، عدل و انصاف، مساوات کا گہوارہ ہوگا کہ جہاں قرونِ اولیٰ کی وہ عمدہ مثالیں صادق آ سکتی ہیں کہ اکیلی عورت بے خوف و خطر ہزاروں میل سفر کرے اور جہاں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ہو۔

مگر ہم نے اسلام کے ان فطری قوانین اور اپنی بقاء، سلامتی، ترقی و خوشحالی کے ضامن اصولوں پر فطرت کے باغیوں اور سرکش عناصر کو ترجیح دے کر جس واحد شعبہ میں بے انتہا ترقی کی ہے وہ جادوگری کی صنعت ہے۔ چنانچہ آج ہمارے گلی کوچوں میں جہاں فیکٹریاں، کارخانے، صنعتی و تجارتی یونٹ عوام الناس کے لیے کسب حلال اور قومی تعمیر و ترقی کا ذریعہ ہونے چاہئیں تھے وہاں آج جادوگر، عامل، سادھو، جوگی، پنڈت، سنیاسی اور جعلی پیر کفر و ضلالت، گمراہی اور تمام تر معاشرتی، سماجی اور اخلاقی برائیوں کی دکانیں سجائے بیٹھے ہیں اور ہماری قوم کے بوڑھے، بچے، مرد و خواتین اپنی دنیا اور آخرت کی ساری جمع پونجی لا کر ان کے قدموں میں ڈھیر کر رہے ہیں۔

اس کے نتیجہ میں آج ہمارے ملک اور معاشرہ کی جو حالت ہے آیئے اس کا مختصر جائزہ لیتے ہیں:

ناموس اولیاء اللہ کا سوال: جادو ٹونے کے بل بوتے پر کئی جعل ساز اولیاء اللہ ہونے کے دعویدار بن کر جعل سازی، فراڈ اور لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہیں اور پیری مریدی کی آڑ میں لوگوں کو غیر فطری، غیر شرعی طریقوں اور طاغوتی ذرائع سے غلبہ و اقتدار، زن اور زر حاصل کرنے کے شارٹ کٹس بتا کر ایک طرف دین اور معاشرے میں بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں تو دوسری طرف ان اولیاء کرام رحمہم اللہ کے ناموس کو بٹہ لگانے کی بھی کوشش کر رہے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں دین کی سربلندی، اصلاحِ معاشرہ اور بے لوث خدمت خلق کے لیے وقف کر دیں۔ چنانچہ تقدس کے پردے میں ناموسِ اولیاء اللہ کے خلاف گھناؤنی سازش بھی پنپ رہی ہے۔

کرپشن اور جعل سازی: جب کسی معاشرے میں پیر اور بزرگ سمجھا جانے والا شخص لوگوں کو جعل سازی، لوٹ مار اور شارٹ کٹس سکھائے گا تو لازم ہے کہ عام آدمی کو بھی جرم کی سند حاصل

ہوگی ۔ کہاں یہ کہ پیری مریدی کو سیاست‘ حکومت‘ دولت‘ شہرت‘ تجارت‘ بالادستی اور اجارہ داری کا ذریعہ بنالیا جائے اور تقدس کے پردے میں ہر طرح کی آزادی کو حق سمجھ کر بڑی سے بڑی کرپشن‘ جعل سازی‘ بددیانتی اور لوٹ مار پر بھی احساسِ جرم نہ ہو تو صاف ظاہر ہے کہ عام آدمی بھی زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے بالادست و اجارہ دار طبقہ کی طرح لمبے ہاتھ مارنے اور شارٹ کٹس اپنانے کو بنیادی حق سمجھے گا۔ چنانچہ آج ہمارا معاشرہ اوپر سے لے کر نیچے تک جعل سازی‘ فراڈ‘ کرپشن اور لوٹ کھسوٹ میں اپنی مثال آپ ہے۔

قومی تعمیر و ترقی میں رکاوٹ: کسی بھی معاشرے کی زبوں حالی اور ترقی میں رکاوٹ کی بنیادی وجوہات صرف دو ہیں‘ ایک قحط الرجال یعنی اہل اور ذہین افراد کا ناپید ہونا اور دوسری بددیانتی یعنی کرپشن اور جعل سازی۔ ہمارا معاشرہ ان دونوں شعبوں میں اب تک خود کفیل ہے۔ جعل سازی‘ کرپشن اور لوٹ کھسوٹ کا درس تو نام نہاد پیروں اور طبقہ اعلیٰ و مقتدر سے ہی ملتا ہے۔ اگر کوئی اپنی قابلیت‘ ذہانت اور محنت کے بل بوتے پر آگے بڑھنے کی تگ و دو کرتا بھی ہے تو کرپشن‘ رشوت اور اجارہ داری اس کا راستہ روک لیتی ہے یا پھر جعلی پیروں اور عاملوں کے ذریعے راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ ہر کام میں ان عناصر پر انحصار کے رجحان نے زندگی کے ہر شعبہ میں صرف انہی لوگوں کو آگے آنے دیا جو معاشرے کے سب سے بدکردار‘ خودغرض‘ بدعنوان اور ابن الوقت قسم کے لوگ تھے‘ جن کا مقصد دونوں ہاتھوں سے ملک و قوم کو لوٹ کر زیادہ سے زیادہ بالادستی و اجارہ داری کا حصول رہا۔ لہٰذا قوم کا جو سرمایہ قومی تعمیر و ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود پر صرف ہونا تھا وہ بالادست طبقے کی جاگیروں اور آسائشوں پر صرف ہوا۔

طبقاتی خلیج: کرپٹ اور ابن الوقت اجارہ دار طبقے کی بے دریغ لوٹ مار سے ملک کنگال اور قوم بے حال‘ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ طبقاتی خلیج بڑھتے بڑھتے نوبت ذات پات اور اونچ نیچ تک جا پہنچی اور اب بالادست طبقہ غریب عوام کے حقوقِ شہریت تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں‘ بلکہ ان سے بحیثیت انسان زندہ رہنے کا حق بھی چھین لینے پر بضد ہے۔ چنانچہ آج ایک طرف غربت کی چکی میں پسے عوام اپنے پیدائشی حقوق کے لیے ایوانِ اقتدار کے سامنے خودکشیاں اور خودسوزیاں کر رہے ہیں تو دوسری جانب اجارہ دار اور بالادست طبقہ ان کے حقوق تسلیم کرنے کی بجائے ان کی تقدیر‘ جان و مال‘ عزت و آبرو اور زندگی پر اپنا پیدائشی حق جتا رہا ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال کے آخری ماہ کے صرف تین دن میں ۱۹۹ افراد جاگیرداروں اور وڈیروں کی نجی جیلوں سے رہا ہوئے۔ پورے سال کے اعداد و شمار اور نجی جیلوں میں قید

بے گناہ غریب بچوں‘ عورتوں اور مَردوں کے اعداد و شمار اس کے علاوہ ہیں۔

عدم برداشت اور جرائم: بالادست اور اجارہ دار طبقہ کے اس غاصبانہ رویے‘ جبر و استبداد اور برسرِعام لوٹ مار کے ردعمل میں عام شہریوں میں بھی عدمِ تحفظ اور احساسِ محرومی کی بدولت برداشت اور مثبت طرزِ فکر کا فقدان ہے اور وہ بھی اپنے ’’حقوق چھین کر لینے‘‘ کی خاطر جرائم کی راہ پر چل نکلے ہیں۔ لہٰذا آج ہمارا معاشرہ ہر طرح کے جرائم کی آماجگاہ بن چکا ہے۔

بدترین اخلاقی انحطاط: جابر و غاصب مقتدر طبقہ کے ہاتھوں بدترین استحصال کے شکار عوام میں تمام تر محرومیوں کا انتقام اور غم و غصہ معاشرہ میں اخلاقیات کی دھجیاں اڑا رہا ہے تو دوسری طرف شرپسند عناصر ’’سنہری مستقبل‘‘ کی خاطر پیری مریدی کو بطور شارٹ کٹ استعمال کرنے کے لیے جادوگری کا رُخ کر رہے ہیں۔ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے بے تاب کئی وہ لوگ بھی ہیں جو معاشرے سے ذاتی محرومیوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں‘ لہٰذا ’’گوہرِ مقصود‘‘ کے حصول میں تمام تر معاشرتی‘ مذہبی‘ انسانی اور اخلاقی اقدار کو پامال کرتے ہوئے شیطان کے چیلوں کی انسانیت سوز شرائط کو پورا کرنے کی خاطر آئے روز ہسپتالوں اور پبلک مقامات سے معصوم بچوں کے اغوا کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا ہے‘ قبروں سے ہڈیاں اور کفن نکالے جا رہے ہیں‘ حتیٰ کہ میتوں کی بے حرمتی جیسے شرمناک واقعات بھی سامنے آ رہے ہیں۔ اور کئی منچلوں نے تو ان ’’سرابوں‘‘ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر اپنی چہیتی بیویوں کے دل کلیجے نکال کر اپنے گروؤں کے ہاتھوں میں تھما دیے۔ مَن پسند شادی‘ پتھر دل محبوب موم‘ ہر مشکل آسان‘ مَن کی مراد حاصل کرنے کے دجالی دعوؤں کی آڑ میں آئے روز شریف اور باوقار گھرانوں کی عزت و ناموس پامال کرنے‘ بے گناہ عورتوں کے اغوا اور معصوم زندگیوں سے کھیلنے کا مکروہ دھندہ اپنے عروج پر ہے۔

ظلم‘ تعصب اور استحصال: بلاشبہ پاکستان کا مقصد ایک پُرامن اسلامی معاشرت کا قیام تھا‘ لیکن روایتی ہندوستانی ’’دجالی تہذیب‘‘ کے فروغ نے ہم پاکستانیوں کی نجی اور سماجی زندگی کو کس حد تک ’’پُرسکون‘ سلامت اور فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ‘‘ رہنے دیا ہے‘ اس سے ہم میں سے ہر ایک آج خوب اچھی طرح سے واقف ہے۔ اس دجالی کلچر کے درندہ صفت طاغوتی اماموں‘ جادوگروں‘ عاملوں‘ جعلی پیروں‘ راہبوں اور پنڈتوں کے زیر اثر کوئی اوباش جب چاہے کسی باعزت پاکستانی شہری کی باعصمت بہو‘ بیٹی‘ بہن کو ’’کورٹ میرج‘‘ کی آڑ میں اپنی داشتہ یا لونڈی بنا کر رکھ سکتا ہے اور اس طرح اسلام کے نام پر بننے والے پاکستان میں

ایک مسلمان عورت نہ چاہتے ہوئے بھی کسی اوباش اور اجنبی شخص کے ساتھ گناہ آلود زندگی گزارنے پر مجبور ہوسکتی ہے۔ کوئی درندہ صفت جب چاہے کسی بھی باعزت اور باغیرت پاکستانی خاتون کی زندگی سے کھیل سکتا ہے۔ کوئی کمینہ صفت جب چاہے کسی بھی خوشحال گھرانے کی پُرسکون اور سلامت زندگی میں زہر گھول سکتا ہے۔ کوئی فسادی جب چاہے کسی بھی پرامن گھر کو اجاڑ کر رکھ سکتا ہے' اور کوئی تخریب کار جب چاہے کسی بھی کامیاب انسان کے وقار' کاروبار' روزگار کو تہہ و بالا کر کے رکھ سکتا ہے۔

روزانہ اخبارات اور ٹیلی مواصلات کتنے ہی گھروں کی بربادی کی خبر لاتے ہیں' کتنے گھروں کی مٹی پلید ہوتی ہے' کتنے باعزت اور باوقار گھرانوں کی عزت و ناموس پامال ہوتی ہے' حوا کی کتنی باعصمت بیٹیاں گھروں کی دہلیز پار کر جاتی ہیں' اور پھر اس کے نتیجے میں دو خاندانوں/برادریوں کے درمیان نہ مٹنی والی مخاصمتیں اور دوریاں' قتل و غارت گری اور فساد کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کتنے گھروں کا روزگار جاتا رہتا ہے' کتنی عورتوں کو زندہ جلایا جاتا ہے' کتنی زندگیاں ویران ہوتی ہیں' کتنی معصوم زندگیوں سے کھیلا جاتا ہے۔

مانا کہ یہ سب معاشرتی مسائل ہر ایک معاشرے کا لازمی جزو ہیں' لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک اور معاشرے میں ان مسائل کے فروغ میں ایک بنیادی محرک (factor) جس کو کسی بھی صورت میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا' خود جادوگری کی صنعت بھی ہے۔ اسی صنعت کے فروغ کے باعث کورٹ میرج' جسے کبھی ظلم کے خلاف قانونی تحفظ کی حیثیت حاصل تھی' آج بذاتِ خود ایک بہت بڑا معاشرتی ظلم بن چکا ہے۔ کب کسی گھر کی عزت و ناموس دہلیز پار کر جائے' کسی کو کچھ خبر نہیں۔

یہ ہمارے معاشرے میں نجی' سماجی' معاشی' معاشرتی' اخلاقی و دینی استحصال' جبر و استبداد اور ظلم و ناانصافی کا صرف ایک پہلو ہے جو ہمارے ملک میں اسلامی کلچر کے فروغ کی بجائے' روایتی ہندوستانی دجالی کلچر کی انتہائی سادہ اور مختصر سی دَین ہے۔ ابھی اس دجالی تہذیب کی اصل کرشمہ سازیاں اور جبر و استبداد اور ظلم و ستم کی انتہا کے کئی پہلو باقی ہیں' جن سے نقاب کشائی ہر ایک داعیٔ دین کا فرض ہے۔

نظریہ کا قتل عام: قیامِ پاکستان کے لیے عظیم تر اور بے مثال قربانیاں پیش کرنے والوں کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا کہ ان کی نسلیں ایک آزاد ملک میں آسانی کے ساتھ اپنی

زندگیوں کو اسلام کے مطابق ڈھال سکیں' مگر افسوس کہ آج یہاں مسلمانوں کو جبراً اسلام سے دور کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ راولپنڈی کے رہائشی عبدالرؤف نے اپنی انتہائی دکھ اور اذیت بھری کہانی سناتے ہوئے بتایا کہ اس کی جواں سالہ تعلیم یافتہ بیٹی کو صرف اس لیے آنکھوں کی روشنی سے محروم اور چلنے پھرنے سے معذور کر دیا گیا کہ اُس نے نماز اور تلاوتِ قرآن چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی طرح پشاور کے راجہ سعید پر جو بیتی' بیان کے قابل نہیں کہ کس طرح ان کے خاندان پر ہندومت کو جبراً مسلط کرتے ہوئے نماز اور تلاوت قرآن کے ترک پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ایسی ہزاروں داستانیں ہمارے معاشرے میں روز کا معمول ہیں' اور ہمارے گلی کوچوں میں پھیلے ملک' نظریہ اور اسلام دشمن عناصر جعلی پیروں' عاملوں' سادھوؤں اور پنڈتوں کے روپ میں نہ صرف بدترین اخلاقی انحطاط اور معاشرتی بگاڑ کا باعث ہیں بلکہ ملک کی نظریاتی سرحدوں پر تیشہ زنی میں بھی مصروف ہیں۔

حکومت اور مذہبی جماعتوں کا کردار: جب بھی پاکستان میں ان عناصر کے خلاف آواز بلند ہوئی ہے یا کسی سماجی تنظیم یا عوام نے دینی اور معاشرتی اقدار کے ان دشمن عناصر کے خلاف تحریک اٹھائی ہے تو انتظامیہ' بیوروکریسی اور اعلیٰ سطحی سیاسی قیادتوں سمیت حکومتی ایوان بھی فوراً ان کے دفاع میں میدان میں اتر آئے ہیں اور انہوں نے کبھی رجسٹریشن کے نام پر تو کبھی محض اسمبلیوں میں قرارداد لانے کے ڈھونگ رچا کر ان دین' دنیا اور سماج دشمن عناصر کو انسانیت کے قتل عام اور انسانی' معاشرتی' مذہبی' اخلاقی اور نظریاتی اقدار کے ساتھ کھلے عام کھلواڑ کا بھرپور موقع فراہم کیا ہے۔ جبکہ رجسٹریشن اور اس طرح کی قراردادوں کا مقصد محض ان عناصر کو تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ مذہبی جماعتیں جو ہمیشہ سے نفاذِ شریعت اور خلافت کی حامی رہی ہیں' قرآن و سنت میں جادوٹونہ کے صریح کفر ہونے اور فوری سزا کے واضح احکامات کے باوجود تمام تر معاشرتی' سماجی اور اخلاقی برائیوں کی اس بنیادی اکائی کے خلاف قانون سازی کے لیے اپنی سفارشات لانے سے گریزاں ہیں۔

دجال کے اصل آثار اور دینی جماعتوں کی غفلت: کوئی نبی نہیں آیا جس نے اپنی اُمت کو دجال کے فتنے سے نہ ڈرایا ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ یہ اتنا خطرناک اور بڑا فتنہ کیوں ہے؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دجال اتنے پُرفریب طریقے سے لوگوں کو دین سے گمراہ کرے گا کہ بڑے بڑے ایمان کے دعویدار اس کے فریب میں آجائیں گے۔ ایسی ایسی کرامات دکھائے گا کہ لوگ اس کو دیکھتے ہی رب ماننا شروع کر دیں گے۔ جبکہ حقیقتاً ان سب کرامات اور

مکروفریب کے پیچھے ابلیس کی کارستانی پوشیدہ ہوگی جس نے روزِ ازل سے قسم اُٹھا رکھی ہے کہ وہ انسانیت کی اکثریت کو گمراہ کر کے چھوڑے گا۔

چنانچہ آج ابلیس کے پیروکار یہ جعلی پیر' عامل' پنڈت اور جوگی شیطانی ذریت کے بَل بوتے پر ایسے ایسے شعبدے دکھا رہے ہیں کہ پڑھے لکھے لوگ بھی ان کے چنگل میں پھنس رہے ہیں' جبکہ جاہل طبقہ تو ان کے مکروفریب کی وجہ سے ان کو خدائی درجہ دیے بیٹھا ہے۔ اگرچہ ان کی حقیقت جادو ہے اور جادو کے کفر ہونے میں قرآن کا حکم واضح ہے' لیکن ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنے مریدوں میں علی الاعلان خدائی کا دعویٰ کر رہے ہیں اور ان کے مریدان کو خدا مان کر سرعام ربِّ کائنات کا انکار بھی کر رہے ہیں۔ گویا دجال کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ اس طرح اہلِ دانش و بینش کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ دجالی تہذیب تیزی سے معاشرے میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہی ہے۔ سول سوسائٹی اور سرکاری اداروں میں دجال کے ان پیروکاروں کا اثر و رسوخ بڑھ رہا ہے۔ خالص العقیدہ مسلمان اور اقامت دین کی جدوجہد کرنیوالے ان کے غیظ و غضب اور انتقامی ہتھکنڈوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ طاغوتی افکار و نظریات رکھنے والے افراد اس ابلیسی لشکر میں شامل ہو رہے ہیں۔ صف بندیاں ہو رہی ہیں' جبکہ دوسری جانب دجال دجال کا ڈھنڈورا پیٹنے والی دینی جماعتوں اور مذہبی حلقوں کو معاشرے میں پھلتے پھولتے اس قدر بڑے دجالی فتنے کا ادراک تک نہیں ہے' جو کہ انتہائی لمحہ فکریہ ہے۔

اس بڑے فتنے کے انسداد کے لیے مذہبی حلقوں اور دینی جماعتوں کو اپنا فوری کردار ادا کرنے کے لیے میدان میں آنا ہوگا۔ چونکہ کفر سب سے بڑا منکر ہے' لہٰذا مذہبی حلقوں اور دینی جماعتوں کو اسی قدر بڑی قوت اور ارادے کے ساتھ جدوجہد کرنا ہوگی' یہاں تک کہ قادیانی مسئلہ کی طرح کفر کے ان ٹھیکیداروں کے خلاف بھی قانون سازی نہ ہو جائے اور قادیانیوں کی طرح ان کو غیر مسلم قرار نہ دیا جائے۔

میں اپنی گزارشات رسول اللہ ﷺ کے اس فرمانِ ذی شان پر ختم کرتا ہوں:

''دو لشکر میری امت کے ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے (دنیا ہی میں) دوزخ سے نجات کا پروانہ دے دیا ہے۔ ایک وہ جو ہند پر حملہ کرے گا اور دوسرا وہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر (یہودیوں اور دجال کے خلاف) جنگ کرے گا۔'' (سنن نسائی)

❁❁❁

رسول اکرم ﷺ کی عظمت، آپ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

Oct.2015
vol. 64

Monthly Meesaq

Regd. CPL No. 115
No.10
Lahore